کہکشاں

حصّہ دوم

SHAD CLASSES

فہرست

حصّۂ نثر

خاکا [1-8]		
○ • نذیر احمد کی کہانی.....	مرزا فرحت اللہ بیگ	3
مضمون [9-28]		
• مٹی کا تیل	خواجہ حسن نظامی	11
• بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق	سید سلیمان ندوی	16
• انشائیہ کیا ہے؟	وزیر آغا	21
انشائیہ [29-36]		
• ہجرت	احمد جمال پاشا	30
داستان [37-48]		
• باغ و بہار	میر امّن دہلوی	39
افسانہ [49-92]		
• ٹوبہ ٹیک سنگھ	سعادت حسن منٹو	51
• پرائمس	جیلانی بانو	60
• بھولے بسرے گیت	شفیع جاوید	69
• ابراہیم سقّہ	سلام بن رزّاق	76
خط [93-111]		
• 'غبارِ خاطر' سے تین خطوط	ابوالکلام آزاد	95

SHAD CLASSES

حصۂ شاعری

نظم [113-145]

- گفتگو — علی سردار جعفری — 116
- میرا سفر — علی سردار جعفری — 120
- کھیتی — عمیق حنفی — 124
- برقِ کلیسا (ظریفانہ نظم) — اکبر الہ آبادی — 128
- متشاعر (ظریفانہ نظم) — ظفر کمالی — 133
- ہم نہیں جانتے (ترجمہ) — یوجینیو مونتالے — 142

غزل [146-164]

- دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں — اسداللہ خاں غالب — 148
- سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں — اسداللہ خاں غالب — 148
- ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا — یگانہ چنگیزی — 153
- مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا — یگانہ چنگیزی — 153
- اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا — خلیل الرحمان اعظمی — 160
- ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا — خلیل الرحمان اعظمی — 160

قطعۂ تاریخ [165-175]

- غمِ ارشد — عطا کاکوی — 167
- دو تاریخیں — واحد نظیر — 170

مرثیہ [176-184]

- یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر — میر انیس — 178

SHAD CLASSES

مزید مطالعے کے لیے

خودنوشت [186-194]

• میں یونی ورسٹی میں — احسان دانش — 188

داستان [195-200]

• فسانۂ عجائب — مرزا رجب علی بیگ سرور — 196

افسانہ [201-213]

• کوارنٹین — راجندر سنگھ بیدی — 202

خطبہ [214-219]

• کامل انقلاب — جے پرکاش نارائن — 214

نظم [220-229]

• شکستِ زنداں کا خواب — جوش ملیح آبادی — 221

• آوارہ — اسرارالحق مجاز — 225

غزل [230-239]

• اگر باہر اپس کے گھر سوں موہن یک قدم نکلے — ولی دکنی — 231

• کوچۂ یار عین کاسی ہے — ولی دکنی — 231

• کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینۂ دل ہوتا — راسخ عظیم آبادی — 236

• ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے — راسخ عظیم آبادی — 236

قصیدہ [240-247]

• تضحیکِ روزگار — مرزا محمد رفیع سودا — 242

گیت [248-254]

• ساتھی ہاتھ بڑھانا — ساحر لدھیانوی — 250

• تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا — ساحر لدھیانوی — 251

SHAD CLASSES

خاکا نگاری

کسی شخصیت کی تحریری تصویر کشی ہی خاکا نگاری ہے۔ یہ تصویر سنجیدہ، متین اور ظریفانہ ہر رنگ کی ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے خاکوں کی نئی نئی قسمیں بنتی ہیں۔ عام طور سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ خاکا نگار شخصیت کے نقش و نگار واضح کرتے ہوئے ذرا سی 'دل لگی' سے باز نہیں آتا۔ اسی طرح اکثر و بیش تر خاکے کہیں نہ کہیں ظریفانہ رنگ لیے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے 'خاکا اڑانا' محاورہ بنا۔ حالاں کہ ایسی بات بالکل نہیں۔ اچھی خاصی تعداد میں ایسے خاکے موجود ہیں جو نہایت سنجیدہ یا عالمانہ ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خاکے ہر طرح سے لکھے جا سکتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ ناول، افسانے، تذکرے اور داستانوں کے ساتھ ساتھ مثنویوں کے قالب میں بھی خاکوں کے بہترین اجزا موجود رہے ہیں۔ کردار نگاری کے مرحلے میں اکثر و بیش تر کردار کا خاکا پیش کرنے کا رواج رہا ہے۔ شاید انھی مقامات سے خاکا نگاری کی ابتدائی شکلیں ملی ہوں، جسے مصنفین نے رفتہ رفتہ ایک آزاد صنف کے طور پر فروغ دے دیا۔ اب کہانیوں، ناولوں کے ساتھ ساتھ الگ سے بھی بھرپور تعداد میں خاکے دستیاب ہیں۔

خاکوں میں بہ یک وقت خودنوشت، سوانح، یادنگاری، انشائیہ اور افسانوں کے ساتھ ساتھ مضمون کے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ خاکا نگار کا کمال یہ ہے کہ ان تمام اصناف کے دائرۂ کار کو سمجھتے ہوئے اپنے خاکے کی حدیں متعین کرے۔ بہترین خاکا وہی ہوگا جس میں سوانح، آنکھوں دیکھے واقعات، شخصیت کے دل چسپ پہلو، صاحبِ خاکا کی اصل قدر و قیمت کا تعین ہو۔ اگر خاکا نگار ان تمام حصّوں میں توازن قائم نہیں کر پاتا تو اُس کی کامیابی پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ خاکا نگار اگر واقعات کی کھتونی جمع کر دے تب بھی وہ اچھا خاکا نہیں کہا جائے گا۔ صاحبِ خاکا کی زندگی کی مشکلات بیان کرنے میں اگر پڑھنے والوں کو رُلاتا ہی رہ جائے تب بھی وہ اچھا خاکا نہیں ہوگا۔ خاکے میں اتنی رنگ آمیزی کر دی جائے کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے بے دم ہو جائے تب بھی خاکا نگاری کے جملہ فرائض ادا نہیں ہوں گے۔ خاکا نگار اگر ان تمام مرحلوں میں ماہرانہ توازن قائم کر دے تو وہ خاکا بے مثال مانا جائے گا۔

اردو میں خطوطِ غالب اور آبِ حیات میں شخصیات کے تعلّق سے ایسے نثر پارے ملتے ہیں جنھیں خاکوں کے سلسلے سے ابتدائی تحریر تصوّر کرنا چاہیے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکا 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' کے عنوان سے لکھا جسے خاکا نگاری کی تاریخ میں شاہ کار تصوّر کیا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے عالمانہ اور سنجیدہ خاکوں کی مستحکم روایت قائم کی۔ اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی نے باضابطہ خاکے لکھے۔ ظرافت نگاروں اور افسانہ نگاروں نے سرگرمی سے خاکا نگاری کی طرف توجہ دی۔ اس صنف کو مقبول بنانے میں اُن کی وقیع خدمات ہیں۔ مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور احمد جمال پاشا؛ افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی اور منٹو نے بہترین خاکے لکھے۔ اب عام طور پر ادیبوں اور شاعروں یا بہت مشہور شخصیات کے ہی خاکے لکھے جاتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کے جدِ امجد مرزا افضل بیگ بدخشاں سے ترکِ وطن کر کے شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ہندستان آئے اور فوج میں ملازم ہوئے۔ فرحت کے دادا مرزا عبد اللہ بیگ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ 1857 کے انقلاب سے یہ خاندان بھی متاثر ہوا اور دہلی سے ہجرت کر کے حیدرآباد دکن چلا گیا۔

تذکرہ نویسوں کے مطابق مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر 1883 میں پیدا ہوئے لیکن خود ان کے بیان کے مطابق وہ اگست 1885 میں تولد ہوئے تھے اور یہی درست ہے۔ جائے پیدائش محلہ چوڑی والان دہلی ہے۔ ان کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ تھا۔ فرحت صرف دس روز کے تھے تو ان کی والدہ مشرّف جہاں بیگم کا انتقال ہو گیا۔ ان کی لاولد اور بیوہ پھوپھی حُسن جہاں بیگم نے انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا۔ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کی مسجد میں ایک بزرگ سیّد ولی اللہ رہتے تھے، انھوں نے ہی ان کی بسم اللہ کرائی۔ مولوی قمر الدین سے کلامِ پاک پڑھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری دروازہ، دہلی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1901 میں ہندو کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں سے 1903 میں انٹرمیڈیٹ کی سند حاصل کی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی۔ اے۔ کیا۔ انھوں نے اسی کالج میں ایم۔ اے۔ میں بھی داخلہ لیا لیکن معاشی حالت کمزور ہونے کے سبب تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ اپنی تعلیمی زندگی کے دوران انھیں کھیلوں سے بہت دل چسپی رہی۔ کرکٹ، ٹینس، بلیرڈ، چوسر اور شطرنج وغیرہ بھی کچھ کھیلتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ تلاشِ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد آئے اور وہاں کے ایک اسکول میں انگریزی کے معلّم بنائے گئے۔ 1908 میں ہائی کورٹ میں مترجم مقرّر ہوئے۔ 1910 میں جوڈیشیل امتحان پاس کیا اور اس میدان میں مختلف عہدوں پر ترقّی کرتے ہوئے 1939 میں ہائی کورٹ کے انسپکٹنگ افسر بنے اور 1942 میں اسی عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی شادی اگست 1908 میں ان کے چچا ساجد بیگ کی لڑکی نسیمہ سلطانہ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح پہلی بیوی کی بہن حمیدہ سلطانہ سے ہوا۔ فرحت اللہ بیگ کا انتقال 27 اپریل 1947 کو بہ عارضۂ قلب ہوا اور ٹھٹھی جیل کے قریبی قبرستان 'سرائے الٰہی چمن' میں سپردِ خاک ہوئے۔

مرزا صاحب نے مضامین لکھے۔ ادیبوں کے حالات قلم بند کیے۔ شاعری بھی کی لیکن ان کی شہرت کا اصل دارومدار ان کے بے مثال خاکے 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی' پر منحصر ہے۔ یہ خاکا پہلی مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے 'اردو' کے شمارہ جولائی 1927 میں طبع ہوا تھا۔ یہ خاکا نہ صرف ان کا بلکہ اردو کے بہترین خاکوں میں ایک ہے۔ 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ' اور 'پھول والوں کی سیر' بھی ان کی یادگار تحریریں ہیں۔ ان کے مضامین 'مضامینِ فرحت' کے نام سے سات جلدوں میں طبع ہوئے۔ ان کی دیگر کتابوں میں 'انشا'، 'دیوانِ یقین'، 'دیوانِ نظیر'، 'میری داستان' اور 'میری شاعری' اہم ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

خاکا

نذیر احمد کی کہانی

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے، کھانا وانا کھایا، سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتا پوچھتے پُچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے۔ دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرا تھا۔ بی چماری رسّی ہاتھ میں لیے اونگھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رسی کو ایک آدھ جھٹکا دے دیتی تھیں۔ کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے، لیکن دروازہ بند تھا، اس لیے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا! اندر زنانہ تو نہیں ہے۔ غرض اس شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں اٹھے اور دبے پانو، چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چوں کہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے، اس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا: کون ہے؟ اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے، مگر بی چماری اچھل پڑیں اور بے اختیار ان کے منھ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا: کون ہے؟ میں نے کہا: میں اور دانی۔ مولوی صاحب نے کہا: آؤ بیٹا اندر آؤ۔ مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد کو سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے، پوچھا: کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی۔ تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد کہا: بھئی ایک کتاب میرے لیے بھی لیتے آنا۔ ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دے دی اور دوسری سے دونوں نے مل کر کام نکالا۔ کب پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آیندہ ذکر کروں گا، ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا، مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلبہ کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی، وہ آئے، ہم سے ملے اور کہا: بھئی، میں بھی تمھارے ساتھ چلوں، مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے؟ ہم نے کہا: چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا۔ انھوں نے کہا: نہیں، پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو۔ ہم نے کہا: یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا، تو ہمارا ذمہ۔ وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو۔ اس عرصے میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: لیتے کیوں نہ آئے۔ ہم نے کہا: وہ ذرا شرمیلے ہیں، بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے کہا:

طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں۔ شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا، ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے، تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر ڈھئی دیے بیٹھے تھے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے۔ مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور کہا: لاؤ کتاب۔ ہم نے کتاب طاق پر سے اتار اُن کے ہاتھ میں دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا: اچھا یہ ہیں میاں رضا! بے چارے رضا نے گردن جھکا کر کہا: جی ہاں۔ مولوی صاحب نے کہا: اچھا بھئی شروع کرو۔

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی، اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق، ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا: ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں؟ کیا منہ میں گھنگھنیاں بھر کر آئے ہو؟ اچھا میاں رضا! تم ہی شروع کرو۔ رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، اگر اِعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے، اس کے بعد کہنے لگے: واہ بھئی واہ! ہم کو بھی عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں۔ میاں رضا! اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے؟ رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں، گردن جھکا کر کہا: بہ سر و چشم۔ مولوی صاحب نے کہا: دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔ انھوں نے کہا: جی نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا: اچھا تو میری صلاح یہ ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا۔ یہ سن کر وہ بچارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا: بھئی رضا! میں نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ میں تم کو بھی ضرور پڑھاؤں گا، مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہوا آیا کرو۔ اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمھارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھیرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بے چارے مُنّی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں، نذیر احمد کے کمرے میں، اس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے۔ بچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستے میں ہم نے ان کو بہت بنایا۔ دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے، اب ہماری بے حیائی کی داستان سنیے۔ میری صرف و نحو بہت کم زور تھی، اور کم زور کیوں نہ ہوتی، شروع کیے ہوئے گے دن ہوئے تھے۔ اِعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا۔ نثر کو تو سنبھال لیتا تھا، مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا، دوسروں کے ہزاروں شعر یاد تھے، اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی، وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے، مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا، جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت چڑ چڑ ہوتے تھے۔

ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا، معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا: ہیں! کیا پڑھا؟ میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی۔ تمام اِعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ انھوں نے پھر بڑے زور سے ''ہوں'' کی۔ ہم نے پھر اِعراب بدل دیے۔ اس سے ان کو غصّہ آ گیا، کہا: دانی! تم تو پڑھو۔ انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا، خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارا ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا۔ کتاب اٹھا کر جو پھینکی، تو کمرے سے گزر، دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا: نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق۔ دانی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا: چلو۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا: ہرگز نہیں۔ انھوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبایا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔

آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اب جاتے ہو یا نہیں! میں نے کہا: مولوی صاحب! جب تک کوئی دھکے دے کر نہ نکالے گا، اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو ابھی پھر آ جائیں گے۔ مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے، کہنے لگے: اچھا نہیں جاتے ہو تو نہ جاؤ، مگر میں ایک حرف تم کو نہ پڑھاؤں گا۔ میں نے کہا: نہ پڑھایئے، مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلیں ہیں، نہ ٹلیں گے۔ کہنے لگے: بیٹا! اس وقت میری طبیعت خراب ہو گئی ہے، اب چلے جاؤ، کل آ جانا۔ دانی نے سچ جانا۔ میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے اور مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اٹھ کھڑے ہوئے، میں نے پکڑ کر ان کو بٹھا لیا۔ مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے، اور آج پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھایئے، ورنہ ہمیں یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے۔ آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے، کہنے لگے: خدا محفوظ رکھے! تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے،

استاد کے استاد ہو گئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا۔ اچھا خدا کے لیے کتاب اٹھالاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو۔ دیکھیے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے۔ میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھالایا اور مولوی صاحب جیسے تھے، ویسے کے ویسے ہو گئے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر اس دن تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمھارے شوق کو آزماتا تھا، مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ یہ بے حیائی نہیں، میاں یہ شوق ہے علم کا، جس کو چسکا ہوتا ہے، وہ بری بھلی سبھی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔

لفظ و معنی

شش و پنج	۔	سوچ و چار، اندیشہ
گنبد کی آواز	۔	گنبد کی گونج
ڈھئی دینا	۔	جم کر بیٹھ جانا
منہ میں گھنگھنیاں بھر کر بیٹھنا	۔	چپ ہو کر بیٹھنا
اِعراب	۔	زبر، زیر، پیش کی علامتیں
گلے پر چھری پھرنا	۔	ظلم ہونا
متنبّی	۔	عربی کا ایک شاعر
گھڑوں پانی پڑنا	۔	نہایت شرمندہ ہونا
بنانا	۔	ہنسی اڑانا
صرف و نحو	۔	گرامر، وہ علم جس میں لفظوں کا جوڑ توڑ اور ان کے بولنے برتنے کا قاعدہ بیان کیا جائے
تقطیع	۔	ٹکڑے ٹکڑے کرنا، شعر کے اجزا کو بحر کے اوزان پر وزن کرنا
برعکس	۔	الٹا
سکتہ	۔	شعر کا وزن پورا نہ ہونا
جز بز ہونا	۔	ناراض ہونا
آنکھوں آنکھوں میں	۔	اشاروں ہی اشاروں میں
زانو	۔	جانگھ، ران
بپھرنا	۔	جوش میں آنا
پنڈ چھٹنا	۔	پیچھا چھٹنا، آزادی ملنا
چسکا	۔	عادت، لت
دبا لینا	۔	دبوچ لینا، قبضے میں کر لینا

آپ نے پڑھا

- 'نذیر احمد کی کہانی' مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا خاکا ہے۔ اردو خاکا نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔ انھوں نے نذیر احمد کا خاکا لکھ کر اردو میں خاکا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ خاکا نثری ادب کی ایک دل کش صنف ہے۔ اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ خاکا نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی سی تصویر ہے۔ اس میں نہ اس کی زندگی کے اہم واقعات کی گنجایش ہے، نہ خاص خاص تاریخوں کی اور نہ زیادہ تفصیل کی۔ مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابل ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انھیں دلچسپ انداز سے بیان کردے تو یہی خاکا ہے۔
- فرحت اللہ بیگ نذیر احمد کے شاگرد تھے۔ اس خاکے میں فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد سے تعلیم حاصل کرنے کے احوال بیان کیے ہیں کہ کس طرح فرحت اللہ بیگ نذیر احمد کے گھر جا کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان سے اِعراب کی غلطیاں ہوا کرتی تھیں، صرف ونحو بھی کمزور تھی۔ نثر کو تو سنبھال لیتے تھے مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ نذیر احمد بار بار سمجھاتے سمجھاتے پریشان ہو کر فرحت اللہ بیگ کو تعلیم دینے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن فرحت اللہ بیگ ٹس سے مس نہیں ہوتے ہیں اور ڈٹے رہتے ہیں کہ وہ انھیں سے تعلیم حاصل کریں گے۔ اسے آپ بے حیائی کہیے یا علم کا شوق لیکن جس کے دل میں پڑھنے کا شوق ہوگا، وہ اپنے استاد کے لاکھ ڈانٹنے پر بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ استاد کی بُری اور بھلی دونوں باتوں کو سنے گا اور سمجھے گا اور ان کی نصیحت مانے گا۔
- فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد نذیر احمد سے بہت کچھ سیکھا اور ان سے متاثر ہوئے۔ ان کی خصوصیات کو بہ چشمِ خود دیکھا تھا۔ اپنے استاد کا خاکا لکھ کر اردو میں خاکا نگاری کی ایسی مستحکم بنیاد ڈالی کہ اردو میں اس صنف کے سیکڑوں قدرداں پیدا ہو گئے۔

آپ بتائیے

1. اردو کا پہلا باضابطہ خاکا کون سا ہے؟

(۱) نام دیو مالی (۲) کندن (۳) شیش محل (۴) ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

2. اردو کا پہلا خاکا نگار کون ہے؟

(۱) رشید احمد صدیقی (۲) مولوی عبدالحق (۳) منٹو (۴) فرحت اللہ بیگ

3. نذیر احمد، فرحت اللہ بیگ کے کون تھے؟

(۱) شاگرد (۲) والد (۳) استاد (۴) چچا

4. فرحت اللہ بیگ کے ساتھ مدرسے میں کون تھے؟

(۱) مسٹر رضا (۲) میاں دانی (۳) مسٹر مبین (۴) میاں شانی

5. نذیر احمد کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(۱) ناول (۲) افسانہ (۳) خاکا (۴) نظم

مختصر گفتگو

1. فرحت اللہ بیگ اور میاں دانی، مولوی صاحب کے گھر کیوں جاتے تھے؟
2. کس عربی شاعر سے متعلق سبق کو پڑھانے کے دوران میاں رضا کی چھٹی ہوگئی؟
3. فرحت اللہ بیگ شعر خوانی میں کس طرح کی غلطیاں کرتے تھے؟
4. میاں دانی شعر پڑھنے میں کیسی غلطیاں کرتے تھے؟
5. مولوی صاحب کے پڑھانے کا کیا طریقہ تھا؟

تفصیلی گفتگو

1. مولوی صاحب اپنے شاگردوں سے کیوں غصہ ہوگئے تھے؟
2. فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد سے کیا سیکھا؟
3. فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھیے۔

- 'جب تک کوئی دھکّے دے کر نہ نکالے گا، اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو ابھی پھر آجائیں گے۔'

1. یہ قول کس کا ہے؟
2. اس قول میں دھکّے دینے کی بات کیوں کہی گئی ہے؟

- 'خدا محفوظ رکھے! تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے، استاد کے استاد ہوگئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں اچھا خدا کے لیے کتاب اٹھالاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو۔'

1. یہ قول کس کا ہے؟
2. یہ بات کس سے کہی گئی ہے؟
3. اس قول میں کس سے چھٹکارا پانے کی بات کہی جارہی ہے؟
4. اس قول میں کون کس کا استاد ہوجاتا ہے؟

آیئے، کچھ کریں

1. نذیر احمد کس صنفِ ادب سے تعلق رکھتے تھے؟ ان کے بارے میں لائبریری سے معلومات حاصل کرکے اپنے خیالات پیش کیجیے۔
2. مرزا فرحت اللہ بیگ کی دوسری تصانیف کے بارے میں اپنے استاد سے معلوم کرکے مطالعہ کیجیے۔
3. نذیر احمد کی تصانیف کی فہرست بنایئے اور پسندیدہ تصنیف کا مطالعہ کیجیے۔

مضمون

عام طور سے کسی خاص موضوع پر جو تحریر قلم بند کی جائے، اسے ادبی اصطلاح میں مضمون کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے Essay لفظ مخصوص ہے۔ انگریزی ہو یا اردو، اس ایک لفظ کے دائرۂ کار میں گاے پر لکھے نوشتے سے لے کر کسی عالمانہ موضوع کا احاطہ کرنے والی تحریر تک کو شامل کیا جاتا ہے۔

غیر افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والی یہ صنف اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے مرکزیت کی حامل رہی ہے۔ بالعموم مضمون نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کسی موضوع کے تئیں معروضی رویہ اختیار کرے اور اس کا نقطۂ نظر عالمانہ ہو۔ مضمون کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنی باتوں کو سلسلے وار طریقے سے بیان کرے اور وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر قادر ہو۔

مضمون کی متعدد اقسام ہیں اور اکثر موضوع یا اندازِ تحریر کی وجہ سے انھیں الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ جس تحریر میں شعر و ادب کی تفہیم اور تعبیر و تشریح کی کوشش ہوگی، اسے تنقیدی مضمون (Critical Essay) کہا جائے گا۔ جس تحریر میں لکھنے والے کا نقطۂ نظر علمی ہو اور تحریر کا انداز بھی عالمانہ شان کا حامل ہو، اُسے علمی مضمون (Literary Essay) کہا جائے گا۔ جس مضمون میں لکھنے والا ظریفانہ رُخ اختیار کرے، اسے ظریفانہ مضمون (Light Essay) کہا جائے گا۔ جس تحریر کا انداز ذاتی یا نجی ہو اور بیان کی شگفتگی بھی قائم رہے، اُسے انشائیہ (Personal Essay) کہا جائے گا۔

غیر افسانوی نثر میں مضمون نویسی کی اہمیت اس وجہ سے بھی قائم ہوئی کیوں کہ اس کا دائرۂ کار نہایت وسیع رہا ہے۔ سرسیّد تحریک کے زمانے سے ہی ایسی تحریروں کے لیے ایک موافق ماحول قائم ہوا۔ سرسیّد کے مضامین ان کے زمانے میں مضمون نویسی کے ماڈل کی طرح دیکھے جاتے تھے۔ حالی اور شبلی سے لے کر مہدی افادی تک ہر ادیب نے ایسے مضامین لکھے۔ ظرافت نگاروں نے ظریفانہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا۔ صحافتی اور دیگر کاروباری ضرورتوں سے بھی مضمون نویسی کے فن کو استحکام حاصل ہوا۔ حالات اور ضرورت کے تحت اس صنف کی نئی قسمیں بنتی رہی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی حضرت سیّد بدرالدین اسحاق کی اولاد میں ہیں۔ حضرت اسحاق، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے ممتاز خلیفہ، داماد اور خادمِ خاص تھے۔ حضرت نظام الدین اَولیا کی روحانی تربیت میں ان کا اہم حصّہ تھا۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی پیدائش دسمبر 1878 میں اندرون کوٹ بستی حضرت نظام الدین اَولیا میں ہوئی جو اُن کا آبائی مکان تھا۔ والدین نے ان کا نام قاسم علی رکھا لیکن ان کے ماموں انھیں علی حسن کہہ کر پکارتے تھے۔ علّامہ اقبال نے انھیں خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ خواجہ صاحب کے والد کا نام سیّد عاشق علی نظامی تھا، والدہ سیّدہ چہیتی بیگم تھیں۔ خواجہ حسن ابھی کم سن تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بڑے بھائی سیّد حسن علی شاہ نے ان کی کفالت کی۔

خواجہ حسن نظامی نے مختلف اساتذہ سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے چچا کی لڑکی سیّدہ حبیب بانو سے نکاح ہوا۔ پہلی بیوی کے وصال کے بعد سیّدہ محمودہ خواجہ بانو سے نکاح کیا۔ خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی بڑی پریشانیوں میں بسر ہوئی۔ انھوں نے حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ 'نظام المشائخ' کی بنیاد ڈالی اور اپنے احباب کے ساتھ مل کر درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور مخالفت برداشت کی۔ انھوں نے مختلف ہندو تیرتھ استھانوں کی بھی یاترا کی اور ہندو سادھوؤں سے فلسفۂ ویدانت سیکھا۔

خواجہ حسن نظامی نے دو سو سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ہر جگہ زبان نہایت سادہ استعمال کی۔ صحافی کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ 'روزنامچے' اور 'قلمی چہرے' تو ایک طرح سے ان کی ایجاد ہیں۔ 1857 سے متعلق ان کی کتابیں پڑھیے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ انھوں نے شری کرشن پر بھی ضخیم کتاب لکھی۔ حضرت نظام الدین اَولیا کی سوانح 'نظامی بنسری' کے نام سے ترتیب دی۔ 'سی پارۂ دل' ان کی انشا پردازی کا اہم نمونہ ہے۔ 31 جولائی 1955 کو ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنی قبر بستی حضرت نظام الدین اَولیا میں پچاس برس قبل ہی تیار کرالی تھی، اسی میں دفن ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی

مضمون

مٹّی کا تیل

خاکسارانِ جہان را بہ حقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بے کار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جا سکے۔ چار عنصر آگ، ہوا، پانی، خاک میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے جو تمام مخلوقات کے پانو میں روندی جاتی ہے۔ پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے اور آگ کی تمازت سے جلا کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی۔ دیکھنے میں اس کی بے چارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی۔ ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا۔ خاص کر انسان، جو اشرف المخلوقات ہے، مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھ ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔

اس ناچیز خاک کی تہہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں جن کو کام میں لا کر انسان آدمی کہلاتا ہے، ورنہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ خیر اور چیزیں تو اپنی جگہ ہیں، مٹّی کے بعض ٹکڑوں کی تہہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے جس کو لوگ مٹّی کا تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کر کے دیکھو تو چنبیلی کا تیل، موتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں اور جہاں مٹّی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آج کل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا ہے۔ اگر گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹّی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کر دیا ہے تاہم اس کا عالم گیر اثر ابھی تک باقی ہے۔ متوسّط درجہ اور ادنا درجے کے آدمی، جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے ہیں، مٹّی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے، جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بوڑھوں کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے، پجاری پوجا کرتے، وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے اور پولس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا ہے۔ غم کی رات میں، جدائی کی رات میں جب مونس و غم گسار پاس نہ ہو تو مٹّی کا تیل جل جل کر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے اور انسان کا شریکِ غم بن کر باعثِ تسلّی ہوتا ہے۔

امریکہ کا راک فیلر اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بہ دولت لاتعداد دولت کا مالک ہے۔ یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے باعث ہندستان کی دولت غیروں کو بانٹ رہا ہے۔ یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے۔

اے خاک نشیں تیل! ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ زار بن کر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں، دریاؤں میں سرگرداں پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔

تو اتنا بے غرض و بے تعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو یا عبادت الٰہی، تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا محتسبی نہیں کر سکتا جو لوگوں کو گناہ سے بچائے یا کم سے کم ان کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کر دے۔ بے شک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا ہے اور بُری طاقتوں کو کام میں لا کر خود تکلیف اٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دنیا میں ایسا ہی امن قائم ہو جائے جس طرح لمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی و نرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

خوشی، شادمانی

لفظ و معنی

خاکسارانِ جہان را بہ حقارت منگر	-	دنیا کے خاکساروں کو حقارت سے مت دیکھ
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد	-	تو کیا جانتا ہے کہ اس غبار میں کوئی سوار ہوگا
عنصر	-	اصل، جڑ
تمازت	-	گرمی، شدت کی گرمی
خمیر	-	سرشت، مزاج، فطرت
اَشرف	-	عزت دار، مہذّب
نایاب	-	نادر، وہ چیز جو میسر نہ آئے
سر چڑھانا	-	بہت منہ لگانا، بہت زیادہ لاڈ کرنا
مات کرنا	-	کسی کام میں بڑھ جانا، بازی لے جانا
عالم گیر	-	جہاں کو فتح کرنے والا، تمام دنیا کا
مونس	-	انس رکھنے والا، دوست
غم گسار	-	غم خوار، ہم درد
مشتعل	-	بھڑکتا ہوا
محتسب	-	حساب لینے والا
لمپ (Lamp)	-	لیمپ، چراغ
نرمی	-	خوشی، شادمانی

آپ نے پڑھا

- 'مٹی کا تیل' خواجہ حسن نظامی کا مشہور مضمون ہے جس میں مٹی کے تیل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مٹی کے تیل کو بھلے ہی حقیر اور بے وقعت سمجھا جائے لیکن اسی کے دم سے آدمی روشنی پاتا ہے۔
- مٹی کے تیل کی خوبی اور افادیت اس قدر ہے کہ چنبیلی اور موتیا کے تیل کی خوشبو بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
- مضمون نگار نے مٹی کے تیل کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کئی ذیلی اور ضمنی واقعات بیان کیے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ بھلے ہی آج بجلی آ گئی ہے لیکن دنیا کے زیادہ تر لوگ اسی تیل کے سہارے اپنی راتوں میں اجالے بھرتے ہیں اور سارے کام کرتے ہیں۔
- مضمون کے آخر میں انھوں نے مکالماتی انداز اپنایا ہے اور مٹی کے تیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم کو تمھاری ساری ادائیں بھاتی ہیں۔ انسان برسوں ٹکریں مارتا ہے، پہاڑوں، دریاؤں میں بھٹکتا ہے پھر بھی تمھاری طرح روشنی پیدا نہیں کر سکتا۔
- مضمون ختم کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نصیحت آمیز رویہ اپناتے ہیں۔ یہ خواجہ صاحب کا خاص انداز ہے۔ وہ چلتے چلاتے تبلیغ و اصلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

آپ بتائیے

1. آگ، ہوا، پانی اور خاک میں سب سے کم ترس کو سمجھا جاتا ہے؟
2. مٹی کے ساتھ دنیا کیا کیا سلوک کرتی ہے؟
3. چنبیلی اور موتیا کے تیل سے بھی اہم مٹی کا تیل ہے، کیسے؟
4. مٹی کا تیل دیکھ کر لوگ کیوں ناک بھوں چڑھاتے ہیں؟
5. مٹی کا تیل تمام تیلوں سے کیوں بڑھ چڑھ کر ہے؟
6. مٹی کا تیل بالکل بے غرض اور بے تعلق ہے، کیسے؟

مختصر گفتگو

1. مٹی کی بے چارگی اور ذلت پر کیوں ترس آتا ہے؟
2. مٹی کی تہہ میں کون کون سے خزانے قدرت نے چھپا رکھے ہیں؟
3. مٹی کا تیل انسان کا شریکِ غم کیسے ہے؟
4. راک فیلر کون تھا اور وہ دولت مند کیسے بنا؟

آئیے

1. اللہ میاں نے مٹی کے تیل میں کیا کیا خوبیاں رکھی ہیں؟ سیاق و سباق کے حوالے سے بتائیے۔

2. بجلی کی روشنی آنے کے بعد بھی مٹی کے تیل کی اہمیت کس طرح باقی ہے؟

3. دنیا کے چار عناصر میں مٹی کا مرتبہ کس طور سے بلند ہے؟

4. ''مٹی کا تیل'' کی روشنی میں پیرو جوان، پارسا اور بدعنوان لوگ کون کون سے کام انجام دیتے ہیں؟

5. مضمون نگار مٹی کے تیل کے کن کن اوصاف کا قائل ہے؟

اس مضمون میں

'کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کردے۔ بے شک تجھ میں س
نے رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہ ہو۔'

- مندرجہ بالا اقتباس کی سیاق وسباق کی روشنی میں تشریح کیجیے۔
- ضد بنائیے۔

بے کار، ذلّت، بدبو، خوب صورت، مالک، روشنی

- واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

مخلوقات، سبق، مُلک، تعلقات، تکلیف، اعمال

- جملے بنا کر جنسیت ظاہر کیجیے۔

خوشبو، شراب، تیل، خاک، مخلوق، اثر

آیئے، کچھ کریں

ا۔ خواجہ حسن نظامی کے متعلق اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔

۲۔ اپنے اسکول کی لائبریری سے خواجہ حسن نظامی کی چند کتابیں تلاش کیجیے اور ان سے پسندیدہ اسباق چُن کر ان کی
رکھیے۔

سیّد سلیمان ندوی

انیسویں صدی کے اواخر میں جن چند شخصیات نے آنکھیں کھولیں اور بیسویں صدی کے آغاز میں جو مدارس اسلامیہ سے فارغ ہو کر قومی منظر نامے پر ابھرنے میں کامیاب رہے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ سیّد سلیمان ندوی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ صوبۂ بہار کی ایک مردم خیز بستی دسنہ جو اب موجودہ نالندہ ضلع میں واقع ہے، وہاں 22 نومبر 1884 کو سیّد سلیمان ندوی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حکیم سیّد ابوالحسن تھا۔ اپنے گانو اور آس پاس کی معدود بستیوں کے علما سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیّد سلیمان ندوی آگے کی تعلیم کے لیے پھلواری شریف اور پھر مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ میں داخل ہوئے۔

اعلا تعلیم کی تمنا نے انھیں 1901 میں دارالعلوم ندوۃ العلما پہنچایا جہاں شبلی نعمانی جیسی شخصیت سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں انھوں نے مولانا فاروق صاحب جڑیا کوٹی سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ دینی اور درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب سے تعلق بھی قائم ہوتا گیا۔ عبدالحلیم شرر کے ناول اور طلسم ہوش ربا جیسی کتابیں وہ تصنیف و تالیف کے پہلے پڑھ چکے تھے۔ 1902 میں ان کا پہلا مضمون پٹنہ کے رسالہ 'الپنچ' میں 'خاتونوں کی تعلیم' عنوان سے شائع ہوا۔ اسی سال مخزن، لاہور میں ان کا ایک مضمون 'آخر وقت' شائع ہوا۔ 1903 سے ان کے اشعار، نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہونے لگیں۔ 1906 میں رسالہ 'الندوہ' کی ادارت بھی سیّد سلیمان ندوی کی تحویل میں آ گئی۔ 1913 میں سلیمان ندوی مولانا ابوالکلام کے اخبار 'الہلال' سے وابستہ ہو گئے۔ 'الہلال' میں وہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ اس کے بعد وہ پھر پونا کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اسی بیچ شبلی نعمانی کی وفات کے ساتھ انھوں نے پونا کالج سے الگ ہو کر دارالمصنفین اور استاد کے باقی ماندہ کاموں کی تکمیل کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ وہ ندوۃ العلما کو مزید بہتر بنانے کے لیے ملکی سطح پر کوشاں رہے۔

سیّد سلیمان ندوی کثیر التصانیف ادیب تھے۔ عربی ادب، اسلامیات، تاریخ، سوانح، ادبیات اور ترتیب و تدوین ان کے خاص میدان ہیں۔ اردو زبان و ادب سے متعلق ان کے مضامین خاص طور پر 'نقوشِ سلیمانی'، 'ہماری زبان کا نام'، 'مضامینِ سلیمان' اور 'مقالاتِ سلیمان' میں شامل ہیں۔ شبلی نعمانی کی حیات و خدمات پر سیّد سلیمان ندوی کی کتاب 'حیاتِ شبلی' قاموسی اہمیت کی حامل ہے۔ شبلی نعمانی کے خطبات اور مقالات کو آٹھ جلدوں میں سیّد سلیمان ندوی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ شبلی کے خطوط بھی انھوں نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ سیرۃ النبی کی جلد اوّل ہی شبلی مکمل کر سکے تھے اور دوسری جلد لکھنے کا مرحلہ نامکمل تھا، سیّد سلیمان ندوی نے دوسری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور پھر تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدیں تصنیف کر کے اپنے استاد کی آخری خواہش پوری کی۔ 'عرب و ہند کے تعلقات'، 'عربوں کی جہاز رانی'، 'سیرتِ عائشہ'، 'خیام' اور 'رحمتِ عالم' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے لسانیات سے متعلق بہت سارے مضامین لکھے۔ انھیں اردو کے ابتدائی ماہرینِ لسانیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

23 نومبر 1953 کو مختصر علالت کے بعد کراچی میں انتقال ہوا۔

بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق

پیٹ کے لیے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میرا خیال ہے، وہی اکثروں کا ہے۔ یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا ناشتہ ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر منہ میں کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لیے ڈھارس ہو جاتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ناشتہ کے لیے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے۔ میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی اور ایک پچھم کی، یعنی عربی اور انگریزی، دونوں میں یہی بات ہے۔ اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا۔ عربی میں اس کو فطور کہتے ہیں، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے اور جس سے افطار کریں، اس کو افطاری کہتے ہیں۔ 'فطور' کے معنی توڑنے کے ہیں، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا۔ ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے۔ فارسی میں اس کے معنی اس بھوکے کے ہیں جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو۔ (مؤید الفضلاء و برہان قاطع)۔ اب دیکھیے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے، یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا۔

اس معنی میں ایک اور لفظ 'نہار' آپ بولتے ہیں، 'نہار منہ' یہ بھی فارسی ہے۔ مگر دیکھیے کہ یہ فارسی ہندستانی سے ایسا مل گیا ہے کہ گویا ہندستانی ہی ہے۔ اس کی اصلیت 'ناہار' ہے۔ 'نا' نفی کے لیے ہے اور 'ہار' کے معنی غذا کے ہیں۔ 'ناہار' یعنی نہیں کھایا ہوا، (برہان قاطع)۔ اب اس سے ناہاری یعنی 'نہاری' تیار ہوئی جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے اور لکھنؤ اور دلّی میں یہ خاص چیز ہو گئی، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چپٹی ملتی ہے۔

'ناہار' سے 'آہار' یاد آیا، آہار آٹے کی اس لئی کو کہتے ہیں جو کاغذ اور کپڑے پر اس لیے چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے، آپ سن چکے ہیں کہ 'آہار' غذا کو کہتے ہیں جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس سے اس لئی کو بھی کہنے لگے جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے۔

روزمرّہ کے کھانوں میں قلیہ، قورمہ بہت عام چیزیں ہیں۔ 'قلیہ' کی شکل عربی ہے مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قَلیَہ ہو سکتی ہے۔ عربی میں قَلی بھوننے کو کہتے ہیں، اس سے قلیہ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں۔ ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے۔

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی سُرخی یعنی عنوان ہے، دیکھیے تو یہ سیاہی سے سُرخی کیسے بن گیا؟ بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لیے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانے میں جب چھاپہ ایجاد ہوا تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سُرخی کہنے لگے، چاہے آپ اس کو سیاہی ہی سے لکھیں۔

'اَحدی' کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں، مگر ان سست کاہلوں کی پیداوار تاریخی ہے، اَحدی، اَحَدی ہے۔ اَحَدی کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو اَحَدی (اکیلا) کا لقب بخشا۔ یہ احدی کھاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے۔ کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اس لیے زبانِ خلق نے اس کو سست و کاہل کے معنوں میں کہہ کر پکارا، زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے۔

ہماری زبان میں ایک لفظ 'قلعی' ہے، آیئے اس کی بھی قلعی کھولیں۔ ہم لکھتے گو قلعی ہیں مگر بولتے قَلَی ہیں۔ ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں۔ برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے۔

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے۔ قَلَعی عربی میں (لسان) اور اس سے فارسی میں (مؤید الفضلا) رانگے کو کہتے ہیں۔ مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں۔ لسان العرب کا بیان ہے کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی۔ اس لیے اس کی طرف نسبت کر کے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں۔ اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں میں سپیدی پھیری جاتی ہے۔ اس لیے اس کو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں پر سپیدی پھیری گئی تو اس کو بھی قلعی پھیرنا کہہ دیا۔ ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ کسی داغ دھبّے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے تو وہ اس پر قلعی پھیرنا ہوا اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کر کے سب کو دکھایا جائے تو وہ قلعی کھولنا ہوا۔

لفظ و معنی

چٹ پٹی	۔	نمک مرچ اور کھٹائی پڑی ہوئی مزے دار
تقویت	۔	طاقت، مدد
قلمی کتاب	۔	ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب، مخطوطہ
باب	۔	کتاب کا حصّہ
امتیاز	۔	فرق، تمیز، شناخت
لقب	۔	وصفی نام، وہ نام جو کسی خاص مدح یا ذم کے سبب پڑ گیا ہو
قلعی کھولنا	۔	کسی کا پوشیدہ راز ظاہر کرنا

آپ نے پڑھا

- اردو زبان وادب کو جن اہل فکر ونظر نے اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے، ان میں سیّد سلیمان ندوی کی حیثیت نمایاں ہے۔ انھوں نے ادب، مذہب، فلسفہ، صحافت اور تاریخ میں قابلِ رشک کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کی قابلیت وعلمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے وقت کے جیّد عالم اور دانشور علامہ شبلی نعمانی نے صرف 17 سال کی عمر میں ان کو 'الندوہ' جیسے تحقیقی وعلمی رسالے کا نائب مدیر مقرر کیا۔ یوں تو سیّد سلیمان ندوی ایک غیر معمولی ذہن کے مالک تھے اور علم کے تمام دروازے ان کے لیے کھلے تھے مگر ان کا خاص میدان تاریخِ اسلام تھا۔ ان کی بیش تر تصانیف اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ سیّد سلیمان ندوی ایک ماہرِ لسانیات تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی دست رس رکھتے تھے۔ ان کی ادارہ ساز شخصیت نے 'دار المصنّفین، اعظم گڑھ' کو پوری دنیا میں ایک وقار عطا کیا۔ انھوں نے ماہنامہ 'معارف' کے ذریعے علمی مضامین کے ذوق کو عام کیا۔
- 'بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق' سیّد سلیمان ندوی کی مشہور کتاب 'نقوشِ سلیمانی' سے ماخوذ ہے۔ اس علمی مضمون میں الفاظ کے معنی کو کئی زبانوں کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ زبان کے علم میں یہ مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
- دنیائے ادب میں سیّد سلیمان ندوی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر لکھنے میں ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ ان کی عبارت میں ادبیت اور پختگی کے ساتھ ساتھ علمیت کی چاشنی رہتی ہے۔ خشک موضوع کو بھی وہ اپنے اسلوبِ خاص سے دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ تفـ
- 'بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق' میں ان لفظوں کے اصل معنی کی وضاحت کی گئی ہے جو روز مرّہ کی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً 'سرخی، نہارمنہ، احدی اور قلعی اور اشیائے خوردنی میں قورمہ، ناشتہ، قلیہ وغیرہ۔ ان لفظوں کے تئیں سماج کے مختلف گروہوں کے دل چسپ رویّوں اور سلوک کا پتا اس مضمون سے بہ خوبی چل جاتا ہے۔

آپ بتائیے

1. بھوک توڑنے کی اصطلاح کیا ہے؟
2. سیّد سلیمان ندوی کتنی زبانوں کے ماہر تھے؟
3. عربی میں ناشتہ کو کیا کہتے ہیں؟
4. فطور کے معنی بتائیے۔
5. لفظ نہار کن دو زبانوں میں استعمال ہوتا ہے؟
6. قلعی کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟
7. سرخی سے کیا مراد ہے؟
8. اَحدی اور اَحَدی کے فرق کو واضح کیجیے۔
9. 'قلعی کھولنا' اور 'قلعی پھیرنا' کے معنی میں کیا فرق ہے؟

10. 'قلعی' کو عربی اور فارسی میں کیا کہتے ہیں؟
11. پورب اور پچھم کی زبانوں سے کون سی زبانیں مصنف مراد لیتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. 'پیٹ کے لیے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے؟' اس کے متعلق سیّد سلیمان ندوی کے خیالات واضح کیجیے۔
2. 'قلیہ' سے کیا مراد ہے؟ اسے عربی اور ہندستانی زبانوں میں کیسے استعمال کرتے ہیں؟
3. نئے اور پُرانے نقطۂ نگاہ سے لفظ 'سرخی' کے معنی کا جائزہ لیجیے۔
4. 'بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق' سیّد سلیمان ندوی کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟
5. سیّد سلیمان ندوی کے استادگرامی کا نام بتایئے۔
6. ہماری زبان میں شوربہ دار گوشت کو کیا کہتے ہیں؟
7. سیّد سلیمان ندوی کی جاے پیدایش دسنہ بہار کے کس ضلع میں ہے؟
8. سیّد سلیمان ندوی کے پڑھنے لکھنے کا خاص میدان کیا تھا؟

تفصیلی گفتگو

1. ہمارے کھانوں میں ناشتے کی کیا اہمیت ہے؟
2. لفظ 'نہار منہ' فارسی اور ہندستانی زبان میں کیسے ایک دوسرے سے متعلق ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. مختلف زبانوں کی روشنی میں لفظ 'قلعی' کا جائزہ لیجیے۔
4. 'بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق' کے فوائد اپنی زبان میں لکھیے۔

- درج ذیل الفاظ سے دو دو محاورے بنایئے۔

آنکھ، پانی، قلعی، جان، چھاتی

- اسم صفت کی تعریف بیان کیجیے اور اس کی قسموں کے نام بتایئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے 'نقوشِ سلیمانی' کا مطالعہ کیجیے اور اس کتاب کی خوبیوں پر اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیال کیجیے۔
2. 'بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق' میں آپ نے جو نئی باتیں سیکھیں، اپنے ساتھیوں سے اس پر گفتگو کیجیے۔
3. کسی دوسرے مصنف کی اس نوع کی تحقیق کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔

وزیر آغا

وزیر آغا ایک ساتھ نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار ہیں۔ 1922 میں موجودہ پاکستان کے سرگودھا کے وزیر کورٹ علاقے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے اردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی۔ کے لیے تحقیق مکمل کی۔ نقاد کی حیثیت سے انھیں سب سے زیادہ اعتبار حاصل ہوا اور 1947 کے بعد ابھرنے والے اردو کے ممتاز ناقدین میں ان کی شناخت قائم ہوئی۔ 'اردو ادب میں طنز و مزاح'، 'اردو شاعری کا مزاج'، 'نظم جدید کی کروٹیں'، 'تخلیقی عمل'، 'تنقید اور مجلسی تنقید'، 'اقبال — تصوراتِ عقل و خرد' وغیرہ ان کی یک موضوعی کتابیں ہیں۔ 'تنقید اور احتساب'، 'نئے تناظر' اور 'معنی اور تناظر' ان کے تنقیدی مضامین کے مشہور مجموعے ہیں۔

وزیر آغا شاعری بالخصوص نظم نگاری کے لیے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے غیر مردّف غزلیں کہنے کا ایک زمانے میں سلسلہ قائم کیا تھا۔ خود نوشت کے شعبے میں انھوں نے شاعرانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنی مشہور طویل نظم 'آدھی صدی کے بعد' لکھی۔ ان کا کلیات 'لفظوں کی چھاگل' مشہور ہے۔

وزیر آغا مشہور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ اتفاق سے اردو میں انشائیے کی صنفی حیثیت کے تعلق سے کافی مباحث سامنے آئے۔ ایک حلقے سے دوسرے حلقے کے اختلافات اس قدر شدید ہیں کہ قارئین کو فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ظریفانہ مضامین کو انشائیہ کہنے کا ایک چلن قائم ہو گیا لیکن وزیر آغا نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر انشائیے کی حدود اور دائرۂ کار متعین کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے خود انشائیے بھی لکھے۔ 'چوری سے یاری تک' اور 'دوسرا کنارہ' ان کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔

مضمون

وزیر آغا

انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ کیا ہے — بادی النظر میں انشائیہ یا ایسے (Essay) کی حدود کو متعین کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے کیوں کہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے انشائیہ کے مفہوم اور ہیئت میں کئی ایک انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں بلکہ ہر انشائیہ کیا بہ لحاظ مواد اور کیا بہ لحاظ ٹکنک ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے لیمب اور چسٹرٹن کے طریقِ کار میں اس قدر تضاد ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح دورِ جدید کے بیش تر لکھنے والوں نے انشائیہ کے سلسلے میں کافی سے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے اور ناقد کے لیے انشائیہ کے مقتضیات اور امتیازی محاسن کو علاحدہ کر کے دکھانا مشکل ہو گیا ہے، تاہم غائر نظر سے دیکھنے پر انشائیہ کی متنوع کیفیات اور ابلاغ و اظہار کے مختلف سانچوں میں پسِ پشت ایک علاحدہ صنفِ ادب کے نقوش واضح طور پر ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم ذرا کوشش سے انشائیہ کی حدود کو متعین اور محاسن کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

ایک چیز جو انشائیے کو دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریقِ کار ہے۔ دراصل انشائیے کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردّ و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریقِ کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردِّ عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید یا تفسیر کا خالق اس افسر کی طرح ہے جو چست اور تنگ سا لباس زیب تن کیے دفتری قواعد و ضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا احتساب اور تجزیے کے جملہ مراحل سے گزرتا ہے اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حقّہ کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرّت سے اپنے احباب سے مصروفِ گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریقِ کار کے بجائے ایک غیر رسمی انداز اختیار کرتا ہے بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردِّ عمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پاس ایسی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ اس طور کہ آپ فی الفور اس کے دائرہ احباب میں شامل ہو جاتے اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔ شاید اسے کوئی واقعہ بیان کرنا ہوتا

ہے یا کسی ذہنی کیفیت پر سے نقاب اٹھانا یا محض زندگی کے مظاہر کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنا ہوتا ہے اور وہ اس صنفِ ادب کا سہارا لے کر اپنی شخصیت یا ذات کے کسی نہ کسی گوشے کو عریاں کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرّت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا، کیوں کہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذّات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک 'سہارے' کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے برعکس ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران آپ شاید حظ، مزاح، تعجب، طنز، اکتسابِ علم اور تخیّل کی سبک روی ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی تاریک گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔ کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاعِ گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرّت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کر دیتا ہے۔

طنز یا مزاح انشائیہ کی ایک اضافی خوبی ہے۔ اس کا جزوِ لاینفک ہرگز نہیں۔ چنانچہ پوربی ادب میں ہمیں بہت سے اعلا درجے کے ایسے انشائیے ملتے ہیں جن میں خیال اور اسلوب کی تازگی ہی سب کچھ ہے لیکن جن میں طنز یا مزاح سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے جہاں کہیں انشائیہ میں طنز یا مزاح مقصود بالذّات قرار پاتا ہے، انشائیہ کا مزاج ہی تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ انکشافِ ذات کے عمل تج کر ایک محتسب یا مسخرے کے طریقِ کار کو اپنا لیتا ہے۔ یہاں ذرا توقف کیجیے تاکہ میں بعض اصولی اور بنیادی باتوں کی طرف آپ کو متوجہ کر سکوں۔ طنز زندگی کی ناہمواریوں کے احساس سے جنم لیتی ہے اور ناہمواریاں صرف اس وقت نظر کی گرفت میں آتی ہیں جب آپ عام ذہنی روش سے اوپر اٹھ کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ طنز نگار وہ شخص ہے جو آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے اور چوں کہ وہ ایک بلند جگہ پر کھڑا ہے اور خود کو ان ناہمواریوں سے محفوظ سمجھتا ہے جنھیں وہ مذاق کا نشانہ بناتا ہے، اس لیے اس کی ہنسی میں جذبۂ افتخار اور احساسِ برتری ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ دوسری طرف مزاح نگار نشیب کے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں وہ خود ناہمواریوں سے ہم آہنگ ہے اور اس کے لیے قدرتی طور پر اس کا ردِ عمل ہمدردی اور محبت سے مملو ہے لیکن ان دونوں کے برعکس انشائیہ نگار نہ تو آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے نہ نشیب سے۔ وہ تو آپ سے ایک ہموار سطح پر ہم کلام ہوتا ہے۔ بے شک طنز و مزاح کا استعمال اس کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں ہے اور وہ اپنے مرکزی نقطے (ہموار سطح) سے لحظہ بھر کے لیے اوپر اور نیچے بھی جاتا ہے، تاہم وہ ہر بار اپنے مرکزی نقطے کو لوٹ ضرور آتا ہے۔ دوسری طرف طنز نگار فراز کے نقطے سے ایک دم نیچے نہیں اترتا اور مزاح نگار نشیب کے نقطے سے ایک قدم اوپر نہیں جاتا۔ اپنے اپنے مرکزی نقطے سے ذرا سی جنبش بھی ان کے لیے مہلک ہے لیکن انشائیہ نگار نسبتاً آزاد ہے اور دونوں اطراف میں آ جا سکتا ہے۔

تاہم خود انشائیہ نگار کے لیے اپنے مرکزی نقطے کو ترک کر کے کسی اور نقطے کو اپنا لینا موت کو آواز دینا ہے۔ پس انشائیہ اور طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور جو لوگ انشائیہ کو 'پہچانتے' ہیں، اسے کسی اور صنف سے خلط ملط کرنے کے کبھی مرتکب نہیں ہوتے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی 'عدم تکمیل' ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع زیر بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطۂ نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل و اکمل صورت اختیار کر لے، وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچیلا ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا اور انشائیہ کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ لکھنے والے نے موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو اس کے شخصی ردِ عمل سے اثر پذیر تھے اور جن کی منفرد کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مصنف ان کو ناظر تک پہنچانے کی سعی کرتا۔ اس مقام پر ایک انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام تر پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے کہ اس میں موضوع کے صرف چند انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے والے کا مقصد آپ کی سوچ بچار کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔ بے شک وہ اپنے موضوع کے بیان میں صرف واردات اور تجربات اور اپنے ذاتی ردِ عمل کے اظہار تک ہی اپنی مساعی کو محدود رکھتا ہے، تاہم اس کے پیشِ نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعہ کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لیے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

انشائیہ نگار کی اس روش کا نتیجہ انشائیہ کی وہ مخصوص صورت ہے جو اسے دوسری اصنافِ ادب سے ممیز کرتی ہے۔ یعنی ایک انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علاحدہ نظر آتا ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ جذبات، احساسات اور تخیلات میں کاٹ چھانٹ اور کفایت کا قائل نہ ہو، اس کے لیے چند لفظوں میں موضوع کی سب سے نوکیلی کیفیات کو پیش کرنا مشکل ہوگا لیکن اختصار کی یہ خصوصیت اس بات کے تابع ہے کہ انشائیے کا پس منظر کس قدر شاداب یا بے آب و گیاہ ہے۔

چناں چہ بقول ہڈسن اگر انشائیہ لکھنے والے نے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کی باتیں ہی گنتی میں کم ہیں اس کے تجربات اور محسوسات تعداد اور شدت میں ہونے کے برابر ہیں تو اس کا لکھا ہوا انشائیہ یقیناً انشائیہ کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔ اس کے برعکس اگر انشائیہ لکھنے والے کا ذہن زرخیز ہے اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن اس نے انشائیہ محدود سی دنیا میں اپنے احساسات اور تخیلات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے تو اس کا انشائیہ یقیناً ایک قابل دید ہوگا اور ناظرین کو وہ تمام کیفیات مہیا کرے گا جو انشائیہ سے مخصوص ہیں۔

ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا آخری وصف سمجھنا چاہیے، اس کی 'تازگی' ہے۔ یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے، جس کے بغیر کوئی بھی صنفِ ادب فن کے اعلا مدارج تک نہیں پہنچ سکتی۔ تاہم شاید انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں، کیوں کہ یہ چیز تو بہر حال انشائیہ میں موجود ہونی چاہیے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان کے بتانے سے پہلے انوکھے پہلو نظر ہی نہیں آتے اور زندگی ہمارے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب محض ہمارے ردِ عمل کا قصور ہے۔ ورنہ زندگی کے دامن میں نئے پہلوؤں کے قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لیے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے پہلو دکھاتا ہے جنھیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں لیا ہی نہیں تھا اور جو ہمارے لیے گویا موجود ہی نہیں تھے۔ اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والے اور ایک غیر ملکی سیاح میں قریبی مماثلت بھی دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح ایک سیاح کو کسی نئے ملک کی بہت سی ایسی انوکھی باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں جو اہلِ وطن کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں، اسی طرح ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے ان تازہ پہلوؤں کو فوراً دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

زندگی کی انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لیے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریق اختیار کرنا جانتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بلندی پر سے زندگی کے بہ ظاہر اعلا اور بلند مظاہر کی پستی کا ایک تصور قائم کرتا ہے یا ایک شریر آئینے میں سے ماحول کا بگڑا ہوا منظر دکھاتا ہے یا پھر زندگی کے تسلیم شدہ قواعد و ضوابط پر نظرِ ثانی سے ہمیں چونکانے لگتا ہے۔ بہر صورت اس کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لیے آزادی دلانا ہے تاکہ ہم غیر جانب دارانہ طریق سے زندگی کے روشن اور تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مکمل نقطۂ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی

طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔

انشائیے کا خالق اپنے موضوع کے انتخاب میں جدّت سے کام لیتا ہے۔ تاہم بات ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ انشائیہ کا خالق مضمون کے تار و پود میں بھی ایک خوشگوار سادگی کو برقرار رکھتا ہے، چنانچہ انشائیہ کے مطالعہ کے بعد ناظر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرّت کی بہت سی منازل طے کر آیا ہے۔ غور کیجیے تو انشائیہ کی امتیازی صورت ایک بڑی حد تک اسی خوشگوار تازگی کی رہینِ منّت ہے۔

لفظ و معنی

بادی النظر	-	سرسری نظر سے، ابتدائی نظر میں، دیکھتے ہی
مقتضیات	-	مقتضا کی جمع، مطالب، ضرورتیں
امتیازی محاسن	-	ترجیحی خصوصیات، الگ سے نظر میں آنے والی خوبیاں
غائر	-	گہرا
متنوع	-	گوناگوں، طرح طرح کا
ابلاغ	-	پہنچانا، بھیجنا
ممیز	-	تمیز کیا گیا، پہچانا گیا
براہین	-	برہان کی جمع، دلیلیں
میلانات	-	میلان کی جمع، خواہشات، رجحانات
ناظر	-	دیکھنے والا
سعی	-	کوشش
احتساب	-	حساب، جانچ پڑتال
فی الفور	-	فوراً، جلدی
مقصود بالذّات	-	وہ چیز جو اصلی مقصود ہو
حظ	-	لطف، خوشی، مزہ
اکتساب	-	کمانا، ذاتی محنت سے حاصل کرنا
پرتو	-	روشنی، پرچھائیں
رفعت	-	بلندی
متاع	-	پونجی

گراں بہا	-	بیش قیمت
جزوِ لاینفک	-	وہ حصّہ جو علاحدہ نہ ہو سکے
تجنا	-	چھوڑنا، ترک کرنا
مَملو	-	بھرا ہوا، لبریز
سنگلاخ	-	پتھریلا
منضبط	-	پیوستہ کیا ہوا
گیاہ	-	گھاس
لحظہ	-	لمحہ، پل، دم بھر
مماثلت	-	مشابہت
تاروپود	-	تانا بانا

آپ نے پڑھا

- 'انشائیہ کیا ہے' پڑھنے کے بعد انشائیے کے حدود و اربع سے آپ کسی حد تک واقف ہو گئے ہوں گے۔ انشائیے کی کوئی جامد تعریف پیش کرنے سے قبل وزیر آغا ان دشواریوں کا ذکر کر دیتے ہیں جو اس کی تعریف کی راہ میں حائل ہیں۔ افسانہ یا ناول کے لوازمات کو جس معروضی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، وہ طریقِ کار انشائیے کے ذیل میں ممکن نہیں۔ اس لیے وزیر آغا انشائیے میں ایک ساتھ کئی باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔
- ادب کی دوسری اصناف اور فنی پیرایوں سے انشائیے کے امتیازات کی بحث میں وزیر آغا نے اس صنف کے غیر رسمی طریقِ کار، شگفتہ موڈ، بہ طور ایک اضافی خوبی طنز و مزاح کے عناصر کی اس میں آویزش نیز ان کے استعمال کی حدِ فاصل جیسے امور کی وضاحت سے اس صنف کے خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔
- اچھے انشائیے میں عدم تکمیلیت، اختصار، تازگی، جدّت اور خوشگوار سادگی جیسے عناصر کی آویزش ہوتی ہے۔ وزیر آغا اپنے مضمون میں ان عناصر کی بحث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کے بعد ہی انشائیے کے پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے 'چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرّت کی بہت سی منزلیں طے' کر لی ہیں۔

آپ بتائیے

1. انشائیہ شعری صنف ہے یا نثری؟
2. کیا انشائیے کو دوسری اصناف ادب سے اس کا غیر رسمی طریقِ کار ممیز کرتا ہے؟
3. وزیر آغا کا تعلّق کن کن ادبی اصناف سے ہے؟ تین کے نام لکھیے۔

4. کیا انشائیہ نگار کا مقصد جدّت طرازی ہے؟
5. انشائیے کی امتیازی صورت کس کی رہینِ منت ہے؟
6. وزیر آغا کی تین کتابوں کے نام لکھیے۔
7. کیا انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے؟
8. کیا انشائیہ دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علاحدہ نظر آتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. انشائیہ اور مضمون میں کیا فرق ہے؟
2. انشائیہ نگار کو دورانِ تخلیق کیسی آزادی میسر ہوتی ہے؟
3. انشائیے کا خالق کس شخص کی طرح ہوتا ہے؟
4. انشائیے میں عدم تکمیل عیب ہے یا ہنر؟ واضح کیجیے۔
5. وہ مرکزی نقطہ کیا ہے جس پر انشائیہ نگار ہر بار ضرور لوٹتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. وزیر آغا نے انشائیے کے لیے کن باتوں کو ضروری قرار دیا ہے؟
2. انشائیے میں تازگی سے کیا مراد ہے؟ یہ کیسے انشائیے کا اہم عنصر بنتا ہے؟
3. انشائیے میں مزاح کی کیا اہمیت ہے؟ واضح کیجیے۔

اس مضمون میں

- ایک چیز جو انشائیے کو دوسری اصناف ادب سے ممیّز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیے کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردّ و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردِّ عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے۔
- انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔

درج بالا اقتباسات کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

- خالی جگہوں کو مناسب لفظ سے پُر کیجیے۔

1. مقالے کی بہ نسبت انشائیے کا ڈھانچا..................ہوتا ہے۔(گٹھا ہوا، ڈھیلا)
2. انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری..................کا احساس ہوتا ہے۔(مماثلت، مخالفت)
3. انشائیہ نگار..................طریق کار اختیار کرتا ہے۔(رسمی، غیر رسمی)
4. انشائیے کی صنف..................موڈ کی پیداوار ہے۔(شگفتہ، غمگین)

- درج ذیل الفاظ کی جنسیت ظاہر کرتے ہوئے جملے بنائیے۔

ہیئت، مضمون، آزادی، صنف، لباس، حصّہ، انشائیہ

- مندرجہ ذیل واحد الفاظ سے جمع بنائیے۔

حد، نقش، ضابطہ، مظہر، صورت

- درج ذیل الفاظ کی ضد بنائیے

تازہ، روشن، حسن، کفر، ارض، ترقی

- مندرجہ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے۔

صورت، ڈھانچا، تاریک، سیاح، علاحدہ

آیئے، کچھ کریں

1. لائبریری جا کر اردو کے مشہور انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا مطالعہ کیجیے۔
2. اپنے اسکول کی کتابوں سے اردو کے چند مشہور انشائیوں کی فہرست تیار کیجیے۔
3. اپنے استاد سے انشائیہ نگاری کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا 1929 میں الہ آباد کے محلّے خلد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شجاعت حسین اور دادا کا نام نجف علی تھا۔ شجاعت حسین کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ احمد جمال پاشا دوسری بیوی سروری خاتون کے بطن سے تھے۔ شجاعت حسین 1940 میں الہ آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور امین آباد کے کٹرا احاطہ میں انھوں نے اپنا مکان خریدا جس کا نام سروری منزل رکھا۔

احمد جمال پاشا نے 1950 میں کوئنس ہائی اسکول لکھنؤ سے میٹرک، 1953 میں کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ، 1956 میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی۔ اے۔ اور 1958 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم۔ اے۔ کیا۔ 1957 میں انھوں نے سرسیّد ہال میگزین 'اسکالر' کا پیروڈی نمبر نکالا۔ اسی سال جھلک بک ڈپو، علی گڑھ نے ان کی کتاب 'مجاز کے لطیفے' شائع کی۔

علی گڑھ سے ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد یہ لکھنؤ واپس آ گئے اور ماہنامہ 'اودھ پنچ' کا اجرا کیا۔ 1961 میں روزنامہ 'قومی آواز' کے شعبۂ ادارت میں شامل ہوئے جس سے جولائی 1976 تک وابستہ رہے۔

احمد جمال پاشا دو مرتبہ ازدواجی رشتے میں بندھے۔ پہلی بیوی سے علاحدگی کے بعد 1966 میں ان کی دوسری شادی سرور جہاں سے ہوئی جو بعد میں سرور جمال کے نام سے مشہور ہوئیں۔ 1976 میں وہ مستقل قیام کی خاطر اپنی سسرال سیوان چلے آئے جہاں 1976 میں انھیں ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج میں اردو لکچرر کی ملازمت مل گئی۔ 28 ستمبر 1987 کو دورانِ ملازمت ہی دل کا دورہ پڑنے سے پٹنہ میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ 29 ستمبر 1987 کو تاہٹہ (سیوان) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

احمد جمال پاشا کُل وقتی ادیب تھے۔ طنز و ظرافت ان کا خاص میدان تھا جس کا اعتراف کرتے ہوئے غالب اکیڈمی نے 1986 کا 'ساگر سوری' غالب ایوارڈ انھیں عطا کیا۔ ان کی اہم کتابوں کے نام اس طرح ہیں: (۱) اندیشۂ شہر (۲) ستمِ ایجاد (۳) لذّتِ آزار (۴) مضامینِ پاشا (۵) چشمِ حیراں (۶) پتّیوں پر چھڑکاو (۷) ظرافت اور تنقید (۸) اردو کے چار مزاحیہ شاعر (۹) فنِ لطیفہ گوئی (۱۰) ملّا نصیر الدین کے لطیفے (۱۱) مجاز کے لطیفے (۱۲) شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت (۱۳) دنیا کی لوک کہانیاں (۱۴) بہادر ٹمبا (۱۵) ہجویاتِ میر (۱۶) غالب سے معذرت کے ساتھ۔

احمد جمال پاشا

ہجرت

بنجاروں کی بستی میں لڑکیاں رسّی بٹ رہی ہیں، عورتیں پتھر کی سلیں گھڑ رہی ہیں، ٹوکریاں بُن رہی ہیں۔ لڑکے نئ
کے کرب کی بانسوں پر مشق کر رہے ہیں، کھانا پک رہا ہے، چولھے کے نزدیک بلّیاں اور کتے مورچے جمائے بیٹھے ہیں۔ سامنے
بنجارے نیزوں پر شکار آویزاں کیے ہنستے گاتے قطار میں چلے آرہے ہیں۔ ان کے خیموں کے اردگرد زندگی کی عجیب چہل پہل
اور ہل چل ہے، بنجاروں کی اس تازہ آباد بستی کے روزانہ دو ایک چکر لگالیتا ہوں۔ اس اجنبی ماحول میں مجھے بڑی کشادگی
مصوبیت اور مسرّت کا احساس ہوا کرتا ہے۔ اس وقت میں اپنے آپ کو قدرت کی آغوش میں محسوس کرتا ہوں۔

ایک صبح جو میں نظارہ کرنے پہنچا تو دیکھا کہ۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

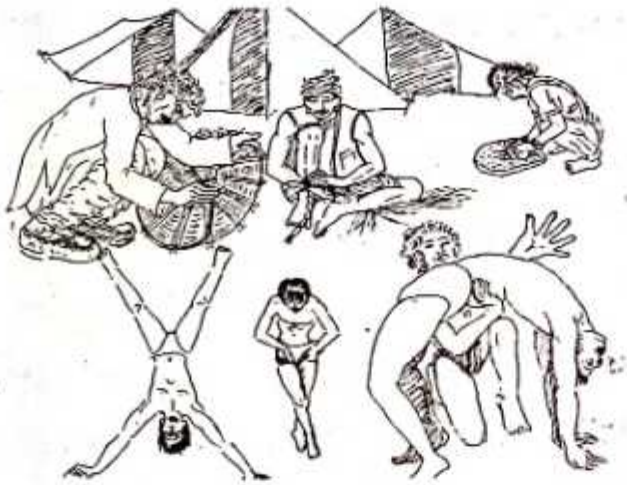

جہاں بستی تھی وہاں زندگی کا ایک تازہ دم قافلہ سرگرمِ سفر ہے۔ خچروں پر ان کے خیمے اور ضروریاتِ زندگی لدی ہوئی تھیں۔ کسی پر معصوم بچے کلیلیں کر رہے تھے تو کسی گدھے پر بلّیوں کے سامنے پنجرے میں میاں مٹھو دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ آگے آگے بنجاروں کا سردار بڑی شان سے سینہ تانے چل رہا ہے۔ ہر طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا۔ لڑکیوں، عورتوں اور لڑکوں کے پیچھے بنجاروں کی صفیں ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ کسی کے ہاتھ میں گائے کی رسّی تو کسی کے ہاتھ میں بکری کی ڈوری کا سرا۔ پیچھے پیچھے سر جھکائے کتے چل رہے ہیں جیسے انھیں اس مقام سے انسیت ہوگئی ہو اور بستی کے اجڑنے سے ان کے دل ٹوٹ گئے ہوں۔

شہر سے دور ریلوے اسٹیشن کے نزدیک اب اس بارونق بستی کی جگہ ایک سنسان اور ویران میدان اپنے مکینوں کو الوداع کہہ رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ بنجارے چل دیے۔ بنجارہ تو سدا کا خانہ بدوش ہے۔ وہ تو ازل سے غذا، چارہ اور پناہ کی تلاش میں ہجرت کے محور پر رقص کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ بھلا خانہ بدوش بھی کبھی کسی جگہ کے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے تو ہر ملک ملکِ ماست والا معاملہ ہے۔ اصل میں یہ تو سائبیریا کی موسمی مرغابیاں ہیں۔ ادھر وقت نے شمالی پہاڑوں اور وادیوں کا گھراؤ شروع کیا اور یہ بادِ شمال کے برفانی حصار کو توڑ کر جنوب کی جانب پرواز کر گئیں۔ زمانے کے شکاری بھی ان کی یلغار نہیں روک سکتے۔ نیلی جھیلوں اور خوش نما چشموں میں بسیرے لیتی، کلیلیں کرتی، ظلمات کے مسافر کی طرح برابر آگے بڑھتی اور بھٹکتی رہتی ہیں۔ بہار کی تلاش میں خزاں سے ٹکراتی، آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی مائل بہ پرواز رہتی ہیں اور اس طرح سائبیریا واپس پہنچ جاتی ہیں۔ گویا شمال سے جنوب مشرق کی جانب وہ سرمائی تعطیلات گزارنے گئی تھیں اور چھٹی ختم ہو جانے پر گھر واپس آ گئی ہیں۔

ان خانہ بدوشوں کے مقابلے میں مہذب انسان کتنا معذور نظر آتا ہے، اس کی خواہشات کا لال قلعہ تو بس ایک مکان ہوا کرتا ہے جسے وہ زندگی بھر جوڑ بٹور کر، مر مر کر، کسی نہ کسی طرح بنا بھی لیتا ہے۔ پھر اس سے بقیہ زندگی بلکہ پشتوں تک طفیلی بیل کی طرح چمٹا زندگی نچوڑتا رہتا ہے۔ خانہ بدوش کا گھر اور دھندا تو معصوم بچّے کا ریت کا گھر ہے۔ خانہ بدوش تو زندگی کا کمھار ہے۔ جس کے چاک سے روزانہ طرح طرح کے گھروندے اور دھندے بنتے رہتے ہیں۔ ادھر ذرا کسی زندگی کے کھلونے کی شکل بگڑی اور اس نے اسے مٹی کے لوندے میں ملا کر پھر مٹی سان دی۔

میں جب بھی خانہ بدوشوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سماج سے کٹے ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ اتنے مکمل کٹ چکے ہیں کہ اب وہ خود ایک سماج بن گئے ہیں جیسے زمین اور چاند اپنے اپنے مدار پر گردشِ ماہ و سال میں مصروفِ سفر ہوں۔ سماج سے کٹ کر وہ اتنے کمزور ہو گئے ہیں جیسے بڑے بھائی کے مقابلے چھوٹا بھائی۔ اسی لیے شہروں اور قصبوں اور دیہاتوں کی آبادیوں کے دلوں میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی رہ گئی ہے نہ عزّت۔ اسی لیے یہ برادرِ خورد بستی کے باہر کسی ریلوے اسٹیشن، تالاب یا افتادہ باغ کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں جہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اسی لیے قانون کا آہنی شکنجہ انھیں کسے رہتا ہے اور ہر ناکردہ گناہ کی سزائیں انھیں خوش آمدید کہتی رہتی ہیں۔ انھیں قدرت کی گود سے چھین کر شہر کے قدموں پر بھینٹ چڑھانے والا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے اور بن باس کا چاند گرہن میں رہتا ہے۔

میں جب بھی ہجرت پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہجرت تو حضرت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کی ہجرت کا سلسلہ تو جنّت سے شروع ہوا تھا، اسے حکمِ سفر ہوا تھا کہ 'جاؤ اور ہماری بنائی ہوئی دنیا میں آباد ہو جاؤ'۔ انسان جنّت کی آرزو اور توقّع میں روزِ آفرینش سے ہجرت میں مصروف ہے کہ یہ جنّت سے نکالا ہوا ابنِ آدم پھر جنّت تک کیسے واپس پہنچے جو اس کی آخری اور مستقل اقامت گاہ ہے جس میں پہنچنے کے بعد ہجرت کا اصلی سلسلہ اپنے ابدی سرے سے مل جائے گا۔

اگر کسی سیاست کے نتیجے میں آپ نے ہجرت اختیار کی ہے یا ہجرت کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا گیا ہے جس میں ہاتھ سیاست کا ہو یا علاقائیت کا سیلاب آپ کو بہالے گیا ہو یا اب تک آپ غیر کے پالے میں تھے اور اب آپ اغیار کے نرغے میں ہیں تو پھر وطن بھی آپ کو راس نہ آیا اور غربت میں آپ کی حالت ایک بے جڑ کے پودے کی ہے۔

سائنس اپنی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر نیچر اور روحانیت سے مل جاتی ہے۔ مادّیت روحانیت کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ناستک سے ناستک سائنس داں بھی آخر میں کلمہ پڑھ کر خدا کے وجود پر ایمان لے آتا ہے۔ اس لیے مجھے شبہ ہے کہ سائنس داں چاند ستاروں پر جو کمندیں ڈال رہے ہیں، وہ ایک سیارے سے دوسرے سیارے کی جانب ہجرت کے جو سامان پیدا کر رہے ہیں، کہیں یہ دریافت اور انکشاف کی آڑ میں جنت تک پہنچنے کا کوئی شارٹ کٹ تو نہیں تلاش کر رہے ہیں۔

ہجرت تو ایک فرض ہے جسے اول یا آخر سب کو ادا کرنا ہے جس میں چوکنے والا بھی اس آخری ہجرت سے نہیں بچ سکتا جس کے محمود اور ایاز بھی پابند ہیں۔ بہتر حالات اور اچھے مستقبل کی تعمیر کے لیے ہجرت کرنے والے اسی لیے پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کر لیتے ہیں کہ ہجرت استحکام کی علامت ہے۔

ہجرت تو سبھی کرتے ہیں۔ اگر آپ کا رزق ملازمت کے دامن سے بندھا ہوا ہے تو آپ کو دورانِ ملازمت سینکڑوں کنویں جھانکنے پڑیں گے۔ تبادلے کی حالت میں آپ کا عمل ایک خانہ بدوش کا ہوگا کہ چولھے چکی سے توتے کے پنجرے تک گرہستی سے لدے پھندے، قریہ قریہ کوچ کرتے، گھر بساتے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کرتے پھریں۔ دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنا نہ صرف ایک تہذیبی عمل بلکہ قانونِ قدرت بھی ہے۔ آپ بے شک مکان بنا سکتے ہیں مگر یہ آپ بھی نہیں بتا سکتے کہ اس میں آپ کو رہنا کتنے دن ہے اور بسنا کس کس کو ہے۔ مکان ہوتے ہوئے بھی شہروں شہروں، بستی بستی کب تک آپ کو پردیس کا پانی پینا ہے۔

اگر آپ دیارِ عرب، یورپ یا امریکہ میں مقدر آزمائی کر رہے ہیں تو پھر آپ کی خانہ بدوشی رنگ لا رہی ہے۔ ایسا مقدر کا سکندر تو ڈال کا ٹوٹا پتا ہے جسے خود نہیں معلوم کہ ہوا کا اگلا جھونکا اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ خود کہاں؟ بیوی بچے، دوست احباب کہاں، وہ جہاں بھی جائے گا اس کا خوشگوار ماضی یادوں کے گھوڑے پر سوار اس کا تعاقب کرتا رہے گا۔

مغرب کی جانب ہجرت تو ایسی ہے جیسے کسی آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔ مغرب غلامی کی علامت ہے۔ اس میں ایک تو مہاجر کو تنہا ہجرت کرنی ہوتی ہے۔ یہاں انصار کا کوئی قافلہ نہیں ہوتا۔ دوسرے کنبے اور کلچر سے دست بردار بن باس میں وہ تنہا دیس سے آنے والے خطوں کے سہارے جیتا ہے۔ ہر خط اس کے لیے ایک نیا دھماکہ ہوتا ہے۔ وہ ایر کنڈیشنڈ مکان میں رہتا ہے۔ موٹروں پر اڑا اڑا پھرتا ہے۔ اپنی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کو کھلونوں کی طرح سجائے ان سے کھیلتا رہتا ہے مگر قوتِ خرید بھی اسے طمانیت اور ذہنی آسودگی نہیں بخش سکتی۔

مہاجر تو چھوٹا بھائی ہے جو اپنے مدار سے ہٹ کر گردش میں ہے۔ خود تو انتہائی بہتر مگر صبر آزما حالات میں ہے مگر دور دراز وطن میں اس کی بیوی اس کے آبائی گھر میں حسب اصول اپنے آپ تپ رہی ہوگی یا کھانا پکانے میں باورچی خانے کی سل پر مسالہ پیس رہی ہوگی۔ سرپرست اور نگراں سے محروم اس کے بچے اسکول سے بھاگ کر گلی میں گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوں گے۔ وہ خود کسی عالی شان دفتر یا عظیم الشان فیکٹری میں ان کے حالات بہتر بنانے کے لیے اوور ٹائم اور زر کشی میں مصروف ہوگا مگر حالات کا اونٹ گھر میں کسی اور کروٹ بیٹھ رہا ہوگا۔

میں جب بھی ہجرت کا تصور کرتا ہوں تو مجھے اس میں انسانی بھائی چارہ، عالمی یک جہتی، استحکام اور وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسا پھیلاؤ جو زمین کے کناروں تک کو سمیٹ لے۔ میں دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے ان گنت اجتماعی اور انفرادی نقطے ہجرت کے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہجرت تو دنیا کی قوموں اور آبادیوں کی تاریخ ہے۔ افراد کا نوشتہ ہے۔ ہجرت تو ایک مسلسل عمل ہے جس کے بغیر متحرک اور فعال دنیا کا کوئی بھی تصور ممکن نہیں۔

لفظ و معنی

کلیل کرنا	۔	ہنسی سے اچھلنا کودنا
انسیت	۔	محبت
ہر ملک ملک ماست	۔	ہر ملک ہمارا ملک ہے
باد	۔	ہوا
یلغار	۔	حملہ
تعطیل	۔	چھٹی
مدار	۔	گردش کی جگہ، دُھری
برادرِ خرد	۔	چھوٹا بھائی
شکنجہ	۔	مجرموں کو سزا دینے کا ایک آلہ
آہنی	۔	لوہے کا
لامتناہی	۔	جس کی انتہا نہ ہو
سرشت	۔	فطرت، مزاج، خصلت
روزِ آفرینش	۔	پیدائش کا دن
ابن	۔	بیٹا
اقامت گاہ	۔	ٹھہرنے کی جگہ

راس آنا - موافق آنا، سازگار ہونا

ناستک - جسے خدا کے وجود کا یقین نہ ہو

کمند - پھندا، جال

قریہ - گانو

نوشتہ - تقدیر، دستاویز

فعال - بہت سرگرم، بہت کام کرنے والا

آپ نے پڑھا

- ''ہجرت'' انشائیے کے مطالعے کے بعد آپ خیالوں کے بھنور میں غوطے لگا رہے ہوں گے۔ احمد جمال پاشا اس کی ابتدا میں بنجاروں کا قصہ پیش کرتے ہیں جن کے پانو میں نہ جانے کب سے چکّر لگا ہوا ہے اور وہ نہ معلوم کب تک ایسے ہی چلتے رہیں گے۔ شہر کی آبادی سے باہر کچھ دنوں کے لیے ڈیرا جمائے بنجارے، مصنف کے ذہن میں خیالوں کا جنگل تیار کر دیتے ہیں اور وہ انھیں ترتیب دیتا ہوا ہمارے لیے غور و فکر کا سامان تیار کر دیتا ہے۔
- تقریباً نصف حصّے کے بعد انسان کی ازلی ہجرت کا واقعہ پیش کر کے مصنف ان اَن چھوئے پہلوؤں تک ہمیں لے جاتا ہے جو ہماری زندگی میں روز بہ روز سامنے آتے ہیں لیکن کبھی بھی وہ باتیں ہمارے لیے لائقِ توجہ نہیں ہوتیں۔ جنّت سے آدم کی ہجرت، تقسیمِ ملک سے انسان کا مہاجر بننا، موت کی شکل میں ہر ذی روح کی لازمی ہجرت، رزق اور ملازمت کے سبب اختیار کی گئی خانہ بدوشی اور ان سب کے نتیجے میں اہلِ خانہ سے پیدا ہوئی دوری سے کمزور ہوتا مستقبل — سب انسان کے ظاہر و باطن میں ایک خلا پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔
- احمد جمال پاشا یوں تو اس پوری تحریر میں منفی گوشوں کو ابھارتے ہیں لیکن سنجیدہ مزاح کے ساتھ بعض مثبت باتیں بھی زیرِ قلم آجاتی ہیں۔ اس انشائیے کے آخری پیراگراف میں ''ہجرت'' عالمی یک جہتی کا اوزار بن جاتی ہے اور آخری سطر رقم کرتے ہوئے پاشا اسے فعالیت کی علامت بنا دیتے ہیں۔
- ان باتوں کو پڑھ کر ہمارے ان جذبوں کو زبان مل جاتی ہے جو ہمیں اندر ہی اندر بے چین کر رہے تھے۔ یہ انشائیہ ایک ذاتی لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کیوں کہ ہم سب کی زندگی میں کہیں نہ کہیں وہ حالات ضرور پیش آئے ہیں، جن کا عنوان احمد جمال پاشا نے ہجرت دے رکھا ہے۔ کیا پایا اور کیا کھویا کی بحث یہاں نہیں ہے بلکہ بعض مرحلوں میں ہجرت ترک کرنے کی خواہش ہوتی ہے جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔
- بنجاروں سے باتوں کی ابتدا کر کے پاشا متوسّط طبقے کی کہانی کے بیان میں خود کو اسیر کر لیتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والوں کو ایک اضافی انسیت معلوم ہوتی ہے۔

آپ بتایئے

1. 'ہجرت' کا تعلق کس صنفِ ادب سے ہے؟
2. بنجاروں کو اور کس نام سے جانا جاتا ہے؟
3. ہر ملک ملکِ ماست سے کیا مراد ہے؟
4. بادِ شمال اور برفانی حصار کے معنی واضح کیجیے۔
5. سرمائی تعطیلات گزارنے کے لیے کون محوِ سفر رہتی ہیں؟
6. کس کے مقابلے میں مہذب انسان معذور ہے؟
7. انشائیہ 'ہجرت' میں کتنے ملکوں کا نام آیا ہے؟ ان کے نام لکھیے۔
8. مغرب کو کس کی علامت کہا گیا ہے؟
9. جنت سے کسے حکمِ سفر ہوا؟
10. انسان کی آخری ہجرت کون سی ہے؟

مختصر گفتگو

1. خانہ بدوشوں کے قافلے کس طرح سفر کرتے ہیں؟ مختصراً بتایئے۔
2. ''ہجرت استحکام کی علامت ہے''۔ کیسے؟
3. ''خانہ بدوش زندگی کا کھارہے''۔ کیسے؟
4. سائبیریا کی مرغابیاں موسمِ سرما میں ہجرت کیوں کرتی ہیں؟
5. احمد جمال پاشا نے سائنس دانوں کو کس نگاہ سے دیکھا ہے؟ اپنے لفظوں میں بتایئے۔

تفصیلی گفتگو

1. تہذیب یافتہ انسانی زندگی اور خانہ بدوشی کی زندگی کا فرق واضح کیجیے۔
2. ہجرتِ انسانی سرشت میں کیسے داخل ہے؟ مفصل جواب قلم بند کیجیے۔
3. مغرب کی جانب ہجرت کرنے والے کو ''آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں قید کر دینے'' کے مترادف کیوں کہا گیا ہے؟
4. انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ واضح کیجیے۔
5. احمد جمال پاشا کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

● مترادفات بتایئے

باد، حصار، نرغہ، یلغار، تعطیل، اغیار، فعال

● دیے گئے الفاظ کی ضد بتایئے۔

ابد، بہار، اجتماعی، حیات، سرما، عزت، مغرب

● قوسین میں دیے گئے الفاظ سے خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

(لال قلعہ، یلغار، سدا، اغیار، شکنجہ)

1. بنجارہ تو.....کا خانہ بدوش ہے۔
2. زمانے کے شکاری بھی ان کی.....نہیں روک سکے۔
3. اس کی خواہشات کا.....تو بس ایک مکان ہوا کرتا ہے۔
4. اسی لیے قانون کا آہنی.....انھیں کسے رہتا ہے۔
5. اب آپ.....کے نرغے میں ہیں۔

● کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' کو ترتیب وار ملایئے۔

الف	ب
جہاں بستی تھی وہاں زندگی کا	گردش ماہ و سال میں مصروف سفر ہیں
بنجاروں کا سردار بڑی شان	چمٹا زندگی نچوڑتا رہتا ہے
پشتوں تک طفلی بیل کی طرح	جو اس کی آخری اور مستقل اقامت گاہ ہے
زمین اور چاند اپنے اپنے مدار پر	ایک تازہ دم قافلہ سرگرمِ سفر ہے
ابنِ آدم پھر جنت تک کیسے پہنچے	سے سینہ تانے چل رہا ہے

● جمع کو واحد میں تبدیل کیجیے۔

ظلمات، خواہشات، احساسات، متحرکات، آبادیوں، نرغے، کنویں

آیئے، کچھ کریں

1. احمد جمال پاشا کے دوسرے انشائیوں کا مطالعہ کیجیے۔
2. اپنے استاد کی مدد سے دوسرے انشائیہ نگاروں کی فہرست بنایئے اور ان کے جو بھی انشائیے آپ کو پسند ہوں، ان کا مطالعہ کر کے دوستوں سے تبادلۂ خیال کیجیے۔

داستان

قصہ گوئی کی سب سے پرانی صنف کے طور پر داستانوں کی واضح اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی ہر زبان میں داستانیں لکھی گئیں۔ ابتدائی دور کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی کہ عربی، فارسی اور اردو میں جو منظوم قصے لکھے گئے، انھیں مثنوی کی صنف کے تحت شناخت ملی۔ عہدِ جدید سے قبل تک جو اردو میں قصہ گوئی ہوئی، اسے داستان کے صنفی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

آج قصہ گوئی کے لیے بھی ترقی یافتہ زمانہ آ چکا ہے۔ داستانوں سے الگ ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف مکمل طور سے قصہ گوئی سے ہی متعلق ہیں۔ اس لیے داستانوں کی شناخت کے لیے موجود سرمایے کی چھان پھٹک کرنے کے بعد نقادوں نے یہ بتایا کہ داستانوں میں ایک ساتھ متعدد قصے اس طرح شامل کیے جاتے ہیں کہ وہ الگ الگ آزادانہ وجود تو رکھتے ہی ہیں لیکن ایک باریک دھاگے سے وہ اصل قصے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ داستان کے فن کی اسی بنیاد کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ 'داستان امیر حمزہ' یا 'الف لیلیٰ' جیسی طویل داستانیں سامنے آئیں۔

داستان کی ایک شناخت مافوق الفطری عنصر بھی ہے۔ شاید ہی کوئی داستان ہو جو اس بنیاد کے بغیر آگے بڑھ سکے۔ مافوق الفطری عناصر کی وجہ سے داستان گو اپنی تخیلاتی قوت کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔ داستانوں میں تہذیب و ثقافت کی حیرت انگیز جلوہ گری ملتی ہے۔ عہدِ قدیم کی زبان اور جینے کے انداز کو جاننے کے لیے داستانوں کا مطالعہ لازم ہے۔ داستان نویسوں نے اپنے گہرے علم اور بھرپور ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے فنی طور پر بہترین کارنامے پیش کیے۔ محاورات اور کہاوتوں کا جتنا بھرپور استعمال ہمارے داستان گویوں نے کیا، اس کی مثال دوسری اصناف میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔

ملّا وجہی کی 'سب رس' کو اردو کی پہلی ادبی داستان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسے انھوں نے 1632 میں مکمل کیا تھا۔ شمالی ہندستان میں اٹھارھویں صدی میں 'قصۂ مہر افروز دلبر' (عیسوی خاں)، 'نوطرزِ مرصّع' (عطا حسین خاں تحسین)، 'نوآئینِ ہندی' (مہر چند کھتری) اور 'عجائب القصص' (شاہ عالم ثانی) جیسی داستانیں اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن داستانوں کی اصل ترقی فورٹ ولیم کالج میں ہوئی، جہاں 'باغ و بہار' (میر امّن دہلوی)، 'آرایشِ محفل' (حیدر بخش حیدری)، 'شکنتلا ناٹک' (مرزا کاظم علی جواں) اور 'نثرِ بے نظیر' (نہال چند لاہوری) جیسی اہم داستانیں لکھی گئیں۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی داستانیں لکھی جا رہی تھیں۔ انشاء اللہ خاں انشا نے 'رانی کیتکی کی کہانی' جیسی مختصر داستان لکھی۔ اس کے علاوہ 'قصۂ عجائب' (عظمت اللہ نیاز دہلوی)، 'باغِ عشق' (بنی نارائن جہاں)، 'الف لیلیٰ' (منشی عبدالکریم)، 'بوستانِ خیال' (خواجہ امان دہلوی رقمہ الدین راقم)، 'گلشنِ نوبہار' (محمد بخش مہجور)، 'فسانۂ عجائب' (مرزا رجب علی بیگ سرور)، 'قصۂ بہرام گور' (میر فرخند علی)، 'طلسمِ ہوش رُبا' (احمد حسین جاہ) جیسی داستانیں فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھی گئیں۔ فسانۂ آزاد (رتن ناتھ سرشار) کو داستان اور ناول کی درمیانی کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔

جیسے جیسے تعلیمی ترقی اور مغرب کے اثرات کا سلسلہ قائم ہوتا گیا، داستانوں کی پیش کش اور تحریر دونوں کا چلن ختم ہوتا گیا۔ قبائلی سماج کی ضرورتوں نے داستانوں کو استحکام بخشا تھا، دیہی سماج میں ان کے لیے تھوڑی بہت گنجایشیں قائم رہیں لیکن شہروں کے جال پھیلتے پھیلتے داستان گوئی کی ساری فضا معدوم ہو گئی۔ آج داستانیں ایک قصۂ پارینہ ہیں۔

میر امّن

میر امّن کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں مختلف لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، ان میں بیش تر قیاسات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے جو مختصر مستند حالات معلوم ہیں، وہ یہ کہ اصل نام میر امّن اور تخلص لطف تھا۔ دلّی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے اجداد مغل بادشاہوں کی رکاب میں رہے اور ان کی خدمات کے صلے میں انھیں جاگیریں بھی عطا ہوئیں۔ جب احمد شاہ ابدالی کی فوج دلّی میں داخل ہوئی تو میر امّن کا گھر بھی لٹنے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سورج مل جاٹ نے ان کی جاگیر بھی ضبط کرلی۔ میر امّن دلّی چھوڑ کر نکلے اور کئی برسوں تک عظیم آباد میں مقیم رہے۔ وہاں سے تلاشِ معاش میں کلکتہ آئے۔ نواب دلاور جنگ نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ دو سال اس خدمت کو انجام دینے کے بعد منشی میر بہادر علی حسینی کے وسیلے سے گل کرسٹ تک پہنچے اور 4 مئی 1801 کو چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر فورٹ ولیم کالج کے ہندستانی شعبے میں ان کا تقرر ہوا۔ جون 1806 تک وہ کالج میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کے سبب 1806 میں انھیں کالج کی خدمت سے سبک دوش کردیا گیا۔ کالج سے علاحدگی کے بعد ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔

میر امّن کی تعلیم کہاں تک تھی، یہ معلوم نہیں۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ فارسی اچھی جانتے تھے۔ اسی کی بدولت انھوں نے فارسی کی مشہور کتاب 'اخلاقِ محسنی' کا کامیاب ترجمہ 'گنجِ خوبی' کے نام سے کیا۔ میر امّن صاحب عیال تھے، ان کے گھر میں چھوٹے بڑے دس آدمی تھے۔

میر امّن کی شہرت جس کتاب سے ہے، وہ 'باغ و بہار' ہے۔ یہ کتاب 1801 میں مکمل ہوچکی تھی۔ اس وقت اس کا نام 'چہار درویش' تھا۔ 1802 میں اس پر نظرِ ثانی ہوئی اور اس کا تاریخی نام 'باغ و بہار' رکھا گیا جس سے 1217ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب مکمل صورت میں پہلی مرتبہ 1804 میں کلکتے کے 'ہندستانی چھاپا خانہ' میں طبع ہوئی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت میر امّن کی اسی تصنیف کو حاصل ہوئی۔

امیر خسرو، گل کرسٹ

1732 - پیدائش

1806 - وفات

باغ و بہار

اے شاہ زادے! تیری یہ حالت بے کسی کی دیکھ کر مجھے یاد آیا اور یہ جی میں ٹھہرایا، کسو طرح تجھ کو ملک صادق کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم بیان کروں۔ غالب ہے کہ وہ دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر، ایک بوزنہ جو باقی ہے، تجھے دے۔ تب ان کی مدد سے تیرا ملک تیرے ہاتھ آوے۔ اور چین، ماچین کی سلطنت تو بہ خاطر جمع کرے، اور بالفعل اس حرکت سے تیری جان بچتی ہے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا، تو اس ظالم کے ہاتھ سے، سوائے اس تدبیر کے اور کوئی صورت مخلصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے اس کی زبانی یہ سب کیفیت سن کر کہا کہ دادا جان! اب تو میری جان کا مختار ہے، جو میرے حق میں بھلا ہو، سو کر۔ میری تسلی کر کے؛ آپ عطر اور بخُور، اور جو کچھ وہاں کے لے جانے کی خاطر مناسب جانا، خرید کرنے بازار میں گیا۔

دوسرے دن میرے اس کافر چچا کے پاس، (جو بجائے ابو جہل کے تھا) گیا اور کہا: جہاں پناہ! شہ زادے کے مار ڈالنے کی ایک صورت میں نے دل میں ٹھہرائی ہے؛ اگر حکم ہو تو عرض کروں۔ وہ کم بخت خوش ہو کر بولا: وہ کیا تدبیر ہے؟ تب مبارک نے کہا کہ اس کے مار ڈالنے میں سب طرح آپ کی بدنامی ہے، مگر میں اسے باہر جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگاؤں اور گاڑ داب کر چلا آؤں۔ ہرگز کوئی محرم نہ ہوگا کہ کیا ہوا۔ یہ بندش مبارک سے سن کر بولا کہ بہت مبارک، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلامت نہ رہے۔ اس کا دغدغہ میرے دل میں ہے؛ اگر مجھے اس فکر سے تو چھڑاوے گا، تو اس خدمت کے عوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے لے جا کر کھپا دے اور مجھے یہ خوش خبری لا دے۔

مبارک نے بادشاہ کی طرف سے اپنی دل جمعی کر کے مجھے ساتھ لیا اور وے تحفے لے کر آدھی رات کو شہر سے کوچ کیا اور اُتر کی سمت چلا۔ ایک مہینے تلک پیہم چلا گیا۔ ایک روز رات کو چلے جاتے تھے جو مبارک بولا کہ شکر خدا کا، اب منزلِ مقصود کو پہنچے۔ میں نے سن کر کہا کہ دادا! یہ تو نے کیا کہا؟ کہنے لگا: اے شہ زادے! جنوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا؟ میں نے کہا: مجھے تیرے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مبارک نے ایک سرمہ دانی نکال کر، سلیمانی سرمے کی سلائیاں میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں۔ وونہیں جنوں کی خلقت اور لشکر کے تنبو قنات نظر آنے لگے؛ لیکن سب خوش رو اور خوش لباس۔ مبارک کو پہچان کر، ہر ایک آشنائی کی راہ سے گلے ملتا اور مزاخیں کرتا۔

آخر جاتے جاتے بادشاہی سَراچوں کے نزدیک گئے اور بارگاہ میں داخل ہوئے۔ دیکھتا ہوں تو روشنی قرینے سے روشن ہے۔ اور صندلیاں طرح بہ طرح کی دو رویہ بچھی ہیں، اور عالم، فاضل، درویش اور امیر، وزیر، میر بخشی، دیوان ان پر بیٹھے ہیں۔

اور یساول، گرز بردار، احدی، چیلے، ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اور درمیان میں ایک تخت مرصع کا بچھا ہے، اس پر ملک صادق تاج اور چار قب موتیوں کی پہنے ہوئے، مسند پر تکیے لگائے، بڑی شان شوکت سے بیٹھا ہے۔ میں نے نزدیک جا کر سلام کیا۔ مہربانی سے بیٹھنے کا حکم کیا۔ پھر کھانے کا چرچا ہوا۔ بعد فراغت کے دسترخوان بڑھایا گیا۔ تب مبارک کی طرف متوجہ ہو کر احوال پر پوچھا۔ مبارک نے کہا کہ اب ان کے باپ کی جگہ پر چچا ان کا بادشاہت کرتا ہے، اور ان کا دشمن جانی ہوا ہے، اس لیے میں انھیں وہاں سے لے بھاگ کر آپ کی خدمت میں لایا ہوں کہ یتیم ہیں اور سلطنت ان کا حق ہے، لیکن بغیر مربّی کسو سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حضور کی دست گیری کے باعث اس مظلوم کی پرورش ہوتی ہے۔ ان کے باپ کی خدمت کا حق یاد کر کے، ان کی مدد فرمایئے۔ اور وہ چالیسواں بندر عنایت کیجیے، جو چالیسوں پورے ہوں۔ اور یہ اپنے حق کو پہنچ کر، تمھارے جان و مال کو دعا دیں۔ سوائے صاحب کی پناہ کے، کوئی ان کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

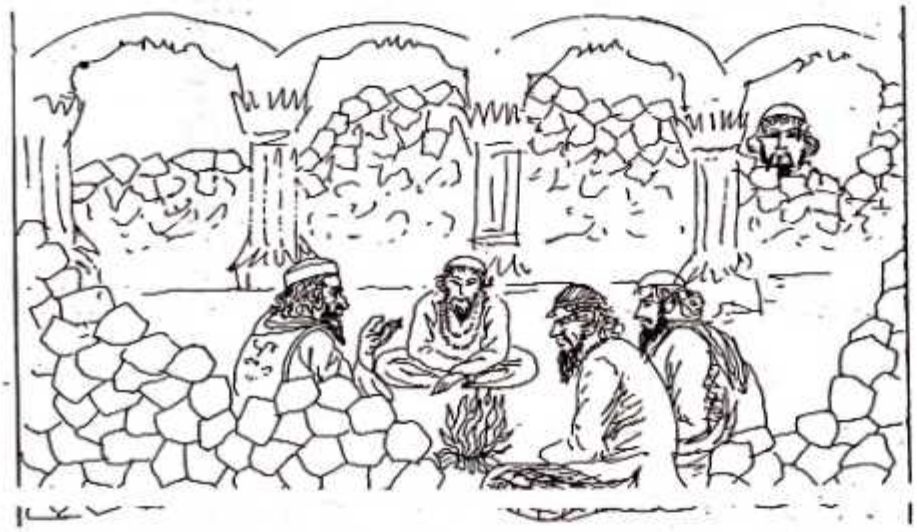

یہ تمام کیفیت سن کر، ملک صادق نے تامّل کر کے کہا کہ واقعی حقوقِ خدمت اور دوستی بادشاہِ مغفور کے ہمارے اوپر بہت تھے اور یہ بچارا تباہ ہو کر، اپنی سلطنت موروثی چھوڑ کر، جان بچانے کے واسطے یہاں تلک آیا ہے اور ہمارے دامنِ دولت میں پناہ لی ہے؛ تا مقدور کسو طرح ہم سے کمی نہ ہوگی اور درگزر نہ کروں گا۔ لیکن ایک کام ہمارا ہے؛ اگر وہ اس سے ہو سکا اور خیانت نہ کی اور بہ خوبی انجام دیا اور اس امتحان میں پورا اترا؛ تو میں قول قرار کرتا ہوں کہ زیادہ بادشاہ سے سلوک کروں گا، اور جو یہ چاہے گا سو دوں گا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا کہ اس فدوی سے تا بہ مقدور جو خدمت سرکار کی ہو سکے گی، بہ سر و چشم بجالاوے گا۔ اور اس کو بہ خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا، اور اپنی سعادت دونوں جہاں کی سمجھے گا۔ فرمایا کہ تو ابھی لڑکا ہے، اس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں۔ مبادا، خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔ میں نے کہا: خدا بادشاہ کے اقبال سے آسان کرے گا۔ اور میں حتی المقدور کوشش کروں گا اور امانت حضور تک لے آؤں گا۔

یہ سن کر ملک صادق نے مجھ کو قریب بلایا اور ایک کاغذ دستگی سے نکال کر، میرے تئیں دکھلایا اور کہا: یہ جس شخص کی شبیہ ہے، اسے جہاں سے جانے، تلاش کر کے، میری خاطر پیدا کر کے لا، اور جس گھڑی تو اس کا نام ونشان پاوے اور سامھنے جاوے، میری طرف سے بہت اشتیاق ظاہر کیجو۔ اگر یہ خدمت تجھ سے سرانجام ہوئی، تو جتنی توقع تجھے منظور ہے، اس سے زیادہ غور پرداخت کی جائے گی۔ والّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔

میں نے اس کاغذ کو جو دیکھا، ایک تصویر نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بہ زور، مارے ڈر کے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا: بہت خوب، میں رخصت ہوتا ہوں؛ اگر خدا کو میرا بھلا کرنا ہے، تو بہ موجب حکم حضور کے مجھ سے عمل میں آوے گا۔ یہ کہہ کر، مبارک کو ہم راہ لے کر جنگل کی راہ لی۔ گانو گانو، بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک، پھرنے لگا اور ہر ایک سے اس کا نام ونشان تحقیق کرنے لگا۔ کسو نے نہ کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں یا کسی سے مذکور سنا ہے۔ سات برس تک اسی عالم میں حیرانی و پریشانی سہتا ہوا ایک نگر میں وارد ہوا۔ عمارت عالی اور آباد، لیکن وہاں کا ہر ایک متنفس اسمِ اعظم پڑھتا تھا اور خدا کی عبادت بندگی کرتا تھا۔

ایک اندھا ہندستانی فقیر بھیک مانگتا نظر آیا، لیکن کسو نے ایک کوڑی یا ایک نوالہ نہ دیا۔ مجھے تعجب آیا اور اس کے اوپر رحم کھایا۔ جیب میں سے ایک اشرفی نکال کر اس کے ہاتھ دی۔ وہ لے کر بولا کہ اے داتا! خدا تیرا بھلا کرے، تو شاید مسافر ہے، اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں نے کہا: فی الواقع سات برس سے میں تباہ ہوا ہوں۔ جس کام کو نکلا ہوں، اس کا سراغ نہیں ملتا، آج اس بلدے میں آ پہنچا ہوں۔ وہ بوڑھا دعائیں دے کر چلا، میں اس کے پیچھے لگ لیا۔ باہر شہر کے ایک مکان عالی شان نظر آیا، وہ اس کے اندر گیا۔ میں بھی چلا۔ دیکھا تو جا بہ جا عمارت گر پڑی ہے اور بے مرمّت ہو رہی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ یہ محل لائق بادشاہوں کے ہے۔ جس وقت تیاری اس کی ہوگی، کیا ہی مکان دل چسپ بنا ہوگا! اور اب تو ویرانی سے کیا صورت بن رہی ہے! پر معلوم نہیں کہ اجاڑ کیوں پڑا ہے اور یہ نابینا اس محل میں کیوں بستا ہے! وہ کور لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا جاتا تھا کہ ایک آواز آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے باپ! خیر تو ہے، آج سویرے کیوں پھرے آتے ہو؟ پیر مرد نے سن کر جواب دیا کہ بیٹی! خدا نے ایک جوان مسافر کو میرے احوال پر مہربان کیا، اس نے ایک مہر مجھ کو دی۔ بہت دنوں سے پیٹ بھر کر اچھا کھانا نہ کھایا تھا، سو گوشت، مصالح، گھی، تیل، آٹا، لون، مول لیا اور تیری خاطر کپڑا جو ضرور تھا، خرید کیا۔ اب اس کو قطع کرا اور سی کر پہن۔ اور کھانا پکا، تو کھا پی کے اس سخی کے حق میں دعا دیں۔ اگرچہ مطلب اس کے دل کا معلوم نہیں، پر خدا دانا بینا ہے۔ ہم بے کسوں کی دعا قبول کرے۔

میں نے یہ احوال اس کی فاقہ کشی کا جو سنا بے اختیار جی میں آیا کہ بیس اشرفیاں اور اس کو دوں لیکن آواز کی طرف دھیان جو گیا، تو ایک عورت دیکھی کہ ٹھیک وہ تصویر اسی معشوق کی تھی۔ تصویر کو نکال کر مقابل کیا۔ سرِ مؤ تفاوت نہ دیکھا۔ ایک نعرہ دل سے نکلا اور بے ہوش ہوا۔ مبارک میرے تئیں بغل میں لے کر بیٹھا اور پنکھا کرنے لگا۔ مجھ میں ذرا سا ہوش آیا، اسی کی طرف تاک رہا

تھا، جو مبارک نے پوچھا کہ تم کو کیا ہو گیا؟ ابھی منہ سے جواب نہیں نکلا، وہ نازنیں بولی کہ اے جوان! خدا سے ڈر، اور بگانے سَتَر پر نگاہ مت کر، حیا اور شرم سب کو ضرور ہے۔ اس لیاقت سے گفتگو کی کہ میں اس کی صورت اور سیرت پر محو ہو گیا۔ مبارک میری خاطر داری بہت سی کرنے لگا، لیکن دل کی حالت کی اس کو کیا خبر تھی؟ لاچار ہو کر میں پکارا کہ اے خدا کے بندو اور اس مکان کے رہنے والو! میں غریب مسافر ہوں۔ اگر اپنے پاس مجھے بلاؤ اور رہنے کو جگہ دو، تو بڑی بات ہے۔ اس اندھے نے نزدیک بلایا اور آواز پہچان کر گلے لگایا اور جہاں وہ گل بدن بیٹھی تھی، اس مکان میں لے گیا۔ وہ ایک کونے میں چھپ گئی۔ اس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ اپنا ماجرا کہہ، کہ کیوں گھر بار چھوڑ کر اکیلا پڑا پھرتا ہے اور تجھے کس کی تلاش ہے؟ میں نے ملک صادق کا نام نہ لیا اور وہاں کا کچھ ذکر مذکور نہ کیا۔ اس طور سے کہا کہ یہ بے کس، شہزادہ چین و ماچین کا ہے چنانچہ میرے ولی نعمت ہنوز بادشاہ ہیں۔ ایک سوداگر سے، لاکھوں روپے دے کر یہ تصویر مول لی تھی۔ اس کے دیکھنے سے سب ہوش آرام جاتا رہا، اور فقیر کا بھیس کر تمام دنیا چھان ماری۔ اب یہاں میرا مطلب ملا ہے، سو تمھارا اختیار ہے۔

یہ سن کر اندھے نے ایک آہ ماری اور بولا: اے عزیز، میری لڑکی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کسو بشر کی مجال نہیں کہ اس سے نکاح کرے اور پھل پاوے۔ میں نے کہا: امیدوار ہوں کہ مفصل بیان کرو۔ تب اس مردِ عجمی نے اپنا ماجرا اس طور سے ظاہر کیا کہ سن اے بادشاہ زادے! میں رئیس اور اکابر اس کم بخت شہر کا ہوں۔ میرے بزرگ نام آور اور عالی خاندان تھے۔ حق تعالیٰ نے یہ بیٹی مجھے عنایت کی۔ جب بالغ ہوئی تو اس کی خوب صورتی اور نزاکت اور سلیقے کا شور ہوا۔ اور سارے ملک میں مشہور ہوا کہ فلانے کے گھر میں ایسی لڑکی ہے، اس کے حسن کے مقابل حور، پری شرمندہ ہے، انسان کا تو کیا منہ ہے کہ برابری کرے۔ یہ تعریف اس شہر کے شہزادے نے سنی۔ غائبانہ بغیر دیکھے بھالے عاشق ہوا، کھانا پینا چھوڑ دیا، اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑا۔

آخر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ میرے تئیں رات کو خلوت میں بلایا اور یہ مذکور درمیان میں لایا اور مجھے باتوں میں پھسلایا، حتیٰ کہ نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا۔ میں بھی سمجھا کہ جب بیٹی گھر میں پیدا ہوئی، تو کسو نہ کسو سے بیاہا ہی چاہیے، پس اس سے کیا بہتر ہے کہ بادشاہ زادے سے منسوب کر دوں، اس میں بادشاہ بھی منت دار ہوتا ہے۔ میں قبول کر کے رخصت ہوا۔ اسی دن سے دونوں طرف تیاری بیاہ کی ہونے لگی۔

لفظ و معنی

کسو طرح ۔ کسی طرح

بوزنہ ۔ بندر

بالفعل ۔ فی الحال، اِس وقت

مخلصی ۔ نجات، چھٹکارا

بخور - وہ چیزیں جن کے آگ پر ڈالنے یا جلانے سے خوش بو نکلتی ہے جیسے لوبان۔

محرم - واقف، رازدار

بندش - تدبیر، سازش

دغدغہ - اندیشہ، ڈر، دھڑکا

آشنائی کی راہ سے - دوستوں کی طرح، دوستی کے طور پر

سَراچہ - بڑا خیمہ

صندلی - ایک طرح کا چھوٹا تخت جسے چوکی کہتے ہیں، کُرسی

میر بخشی - سلطنت کا ایک اعلا عہدے دار، فوج کی تنخواہ بھی اس سے متعلق ہوتی تھی

دیوان - وزیرِ مال۔ محکمۂ مال کا بڑا افسر

دورویہ - دونوں طرف

یَساوَل - چوب دار، نقیب

گرز بردار - وہ سپاہی جن کا اصل ہتھیار گرز ہوتا تھا جسے وہ کندھے پر رکھ کر چلتے تھے

اَحَدی - تیر انداز

چیلا - خاص شاہی ملازم، شاہی غلام

مرصّع کا تخت - جڑاؤ تخت، جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں

چار قُب - ایک طرح کا لباس جسے امرا پہنتے تھے

تامّل - سوچ بچار، اندیشہ

موروثی - باپ دادا کا، پشتینی، جدّی

دامنِ دولت - بادشاہ یا امیر کا سہارا یا پناہ

اِلتماس - درخواست، گزارش

فِدوی - جاں نثار، قربان ہونے والا

مَبادا - ایسا نہ ہو

حتی المقدور - جہاں تک طاقت ہے، امکان بھر

دستکی - چھوٹی سی جیبی کتاب جو یادداشت وغیرہ کے لکھنے کے کام آتی ہے، پاکٹ بک

شبیہ - شکل، تصویر

غور پرداخت - دیکھ بھال، پرورش

وَالّا نہ - ورنہ

بہ موجب	۔	مطابق
متنفس	۔	جان دار، انسان
اسمِ اعظم	۔	خدا کے ناموں میں سب سے بڑا نام
فی الواقع	۔	حقیقت میں، واقعی
بلدہ	۔	شہر
کور	۔	نابینا، اندھا
مُہر	۔	اشرفی
لون	۔	نمک
سرِ مو	۔	بال بھر، ذرا سا
تفاوت	۔	فرق
ولی نعمت	۔	پرورش کرنے والا، سرپرست
ہنوز	۔	ابھی تک، اب تک
اکابر	۔	سردار، امیر
اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑنا	۔	تنہائی اختیار کر لینا، غم یا غصے کے سبب سے الگ پڑ رہنا
میرے تئیں	۔	میرے متعلق
خلوت	۔	تنہائی
نسبت ناتا	۔	شادی بیاہ، رشتے داری
منسوب کرنا	۔	نسبت کرنا، منگنی یا نکاح کرنا
منّت دار	۔	احسان مند

آپ نے پڑھا

- 'باغ و بہار' اردو کی ان لازوال کتابوں میں سرِ فہرست ہے جن پر وقت کی کبھی گرد نہیں پڑی۔ قصّہ گوئی کی روایت کا وہ کون سا گُر ہے جو میر امّن کو معلوم نہیں۔ پڑھنے والوں کو اپنے قبضے میں رکھا جائے، اس کے لیے قصّہ گو کے پاس جتنے ہتھیار ممکن ہیں، وہ سب میر امّن نے باغ و بہار میں استعمال کر لیے ہیں۔ ایک بڑے قصّے میں چھوٹے چھوٹے قصّوں کا داخلہ یعنی قصّہ در قصّہ کی مرغوب داستانی سلیقہ مندی میر امّن کا واقعتاً کارنامہ ہے۔ اس کی وجہ سے بنیادی قصّے اور ذیلی قصّے کا توازن بھی قائم رہتا ہے اور واقعات کی دل چسپی کے سہارے ہم اصل قصّے سے غافل بھی نہیں ہوتے۔ نشست و برخاست، آدابِ محفل، عوام و خواص کی مجالس، اچھے اور برے حالات میں کام کرنے کا انداز — ان سب امور سے میر امّن نے ہند، ایرانی اور اسلامی تہذیب و ثقافت

کے احوال ابھارے ہیں۔ باغ و بہار میں قصہ چاہے جس ملک کا بھی ہو، اس میں ہندستانی ماحول کی جھلک ضرور شامل ہے۔

- میر امّن کو اردو میں سادہ نثر گوئی کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ 'باغ و بہار' سے ہی اردو میں یہ بات روشن ہوئی کہ نثر کو شاعرانہ حربوں سے الگ کر کے ہم اسے آزادانہ طور پر قائم کر سکتے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ 'باغ و بہار' سلیس نثر نویسی کی پہلی تجربہ گاہ ہے۔ میر امّن نے عربی اور فارسی روایات اور شاعری کی بھرپور تربیت کو درکنار کرتے ہوئے نثر کو اپنی اصل بنیادوں پر کھڑا کرنے کا حوصلہ دکھایا۔ انھوں نے روایتی طور پر زبان و ادب کی جو تعلیم حاصل کی تھی، اس کے بہت سارے معاملات میں اختلاف کرتے ہوئے نیا تجربہ کیا۔ ترجمہ کرتے وقت مافی الضمیر کی ادائیگی میں وہ واقعات میں ضروری گھٹانے بڑھانے کو بہ حیثیت مترجم اپنا حق سمجھتے ہیں۔ مترادفات اور ہم معنی الفاظ کا بے دریغ استعمال، جمع کے ساتھ جمع الجمع کا استعمال اور ہم معنی فقروں سے عبارت کو سجانے کا عمل میر امّن کی اسلوبیاتی سطح پر زبردست حکمتِ عملی ہے۔
- 'باغ و بہار' کے بعد میر امّن نے ایک اور کتاب 'گنج خوبی' بھی ترجمے کی شکل میں پیش کی۔ لیکن اسے کسی نے توجہ سے نہیں دیکھا۔ میر امّن کے بعد کے نثر نگاروں نے 'باغ و بہار' کی نثر کو مثالی نثر کا نمونہ سمجھا اور غالب، سرسیّد، حالی سے ہوتے ہوئے پریم چند تک اردو نثر نے سلیس اور سادہ زبان کو جو فروغ دیا، وہ صرف 'باغ و بہار' کے راستے پر چل کر ممکن ہوا۔ پریم چند کے بعد سادہ نثر گوئی نے اپنے پانو اتنی مضبوطی سے جما لیے کہ پھر کسی کو غیر ضروری طور پر آرائشی نثر کی وکالت کرنے کا موقع ہی نہیں رہا۔

کچھ اور باتیں

- 1217ھ بہ مطابق 1801 میں میر امّن نے فارسی میں شہرت رکھنے والے 'قصہ چہار درویش' کے اردو ترجمہ 'نوطرز مرصّع' از عطا حسین خاں تحسین کو جان گل کرسٹ کی ہدایت پر 'ٹھیٹھ ہندستانی گفتگو' میں جو ''اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چلے جاتے ہیں،'' ترجمہ کیا۔
- 1802 میں کالج کی طرف سے اس کتاب پر میر امّن کو پانچ سو روپے کا انعام ملا۔
- یہ اقتباس میر امّن دہلوی کی مقبول تصنیف 'باغ و بہار' کے 'چوتھے درویش کی سیر' سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس میں سہ طرفہ قصہ کا اختتام طربیہ کی جانب گامزن ہے لیکن داخل میں تینوں کہانیوں میں المیہ پوشیدہ ہے۔
- شاہزادہ موروثی سلطنت اپنے والد کی عدم موجودگی سے کھو دیتا ہے۔ خاندانی حکومت پر اُس کے چچا قابض ہو جاتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح شاہزادے سے چھٹکارا پا لیں۔ گرچہ شاہزادے کے بہی خواہ اسے چچا کے قہر سے بچانے کی غرض سے اس کی مدد اس کے والد کے دوست ملک صادق سے کرانا چاہتے ہیں یا اس چالیسویں بندر کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو چالیس پورا ہونے پر حرکت میں آ کر ایک بڑی طاقت بن جائے۔
- ملک صادق دل و جان سے مدد کرنے کو تیار ہے لیکن اسے بھی ایک نازنین کی تلاش ہے جس کی تصویر اس کے پاس ہے۔ وہ

مختصر گفتگو

1. مبارک، شہزادے کو اس کے چچا سے نجات دلانے کے لیے کیا مشورہ دیتا ہے؟
2. سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مبارک نے بازار سے کون سی چیزیں خریدیں؟
3. سلیمانی سرمے کی کیا خوبی تھی؟
4. مبارک ملک صادق سے کس مقصد کے تحت ملنے گیا؟
5. ملک صادق نے شہزادے کی مدد کے لیے کون سی شرط رکھی؟
6. شہزادہ فقیر کی بیٹی کو دیکھ کر کیوں بے ہوش ہو گیا تھا؟
7. ملک صادق نے شہزادے کو کس بات کی تاکید کی تھی؟
8. فقیر نے اشرفی لے کر شہزادے سے کیا کہا؟
9. پورے ملک میں فقیر کی بیٹی کی شہرت کیوں تھی؟

تفصیلی گفتگو

1. شہزادے کے سفر کا حال اپنی زبان میں لکھیے۔
2. مبارک نے شہزادے کے لیے کون سی خدمات انجام دیں؟
3. میر امّن کو باغ و بہار پر کیوں انعام ملا؟
4. 'باغ و بہار' ہندستانی تہذیب و تمدن سے میل کھاتی ہے یا نہیں، وضاحت کریں۔
5. 'باغ و بہار' کی نثر کی کیا اہمیت ہے؟

- درج ذیل الفاظ کی جنسیت واضح کرتے ہوئے جملے بنائیے۔

تدبیر، امانت، ویرانی، سیرت، بدنامی

- مترادفات یا ہم معنی لفظ بتائیے۔

بادشاہ، پیر، تحقیق، علم، شبیہہ، نابینا

- درج ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔

مردِ عجمی، ظالم، مخلصی، تدبیر، مجرم، بندش، دغدغہ

- اسے غور سے پڑھیے۔

''اگر مجھے اس فکر سے تو چھڑاوے گا، تو اس خدمت کے عوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے لے جا کر کھپا دے اور

شاہزادے کو اس کی تصویر دے کر اس کی تلاش کر کے لانے کے لیے کہتا ہے۔ بار بار اس نازنین کو دیکھ کر خیانت نہ کرنے کی تاکید کرتا ہے کیوں کہ وہ نازنین اس کی امانت تھی۔

- تلاشِ بسیار کے بعد وہ نازنین شاہزادے کو ملتی ہے۔ اس کے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ کر شاہزادہ ملک صادق کا ذکر نہیں کرتا ہے خود تصویر دیکھنے کے بعد اپنے ہوش وحواس اور عیش وآرام کھونے کا ذکر کرتا ہے۔
- اندھا فقیر اپنی بیٹی کی کہانی الگ بیان کرتا ہے۔ اس کے ملک کا شاہزادہ اس کی بیٹی کو بغیر دیکھے اس کے حسن کی شہرت سن کر شادی کی پیش کش کرتا ہے۔ شادی کی تیاریاں دونوں طرف سے ہونے لگیں۔
- حسرت زدہ نامراد عاشق کی یہ کہانی عزم، ہمت، جرأت اور استقلال کی بدولت منزلِ مقصود کو پانے کے لیے ناکامی کے زہر سے کامیابی کی جانب گام زن رہنے کی تلقین کرتی ہے۔
- تشنہ آرزوؤں سے مزین 'باغ و بہار' کا یہ حصہ تین سلطنتوں کا ماجرا بیان کر رہا ہے۔ قصے کا حالتِ بے کسی و بے بسی سے شروع ہو کر شادی کی تیاری پر ختم ہونا گرچہ مسرت وانبساط کی جھلکیاں پیش کرتا ہے لیکن فقیر کی مایوسانہ گفتگو میں تمناؤں کے منہدم ہونے کی داستان بھی پہلو بہ پہلو موجود ہے۔

آپ بتایئے

1. 'باغ و بہار' کا تعلق کس صنف سے ہے؟
2. 'باغ و بہار' کس کی تصنیف ہے؟
3. 'باغ و بہار' کہاں لکھی گئی؟
4. 'باغ و بہار' کس کتاب کا ترجمہ ہے؟
5. 'باغ و بہار' پر مصنف کو کتنے روپے کا انعام ملا تھا؟
6. 'باغ و بہار' کا سنہ اشاعت بتایئے۔
7. 'باغ و بہار' میں کتنے درویشوں کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے؟
8. کس کی خواہش پر میر امّن نے 'باغ و بہار' جیسی کتاب ترجمہ کی؟
9. اس اقتباس میں کن کن ملکوں کا ذکر ہے؟
10. شاہزادے کے والد اور ملک صادق کے درمیان کیا رشتہ تھا؟
11. شاہزادہ فقیر کو کتنی اشرفیاں دیتا ہے؟
12. اندھے فقیر کا تعلق کس ملک سے تھا؟

شاہزادے کو اس کی تصویر دے کر اس کی تلاش کر کے لانے کے لیے کہتا ہے۔ بار بار اس نازنین کو دیکھ کر خیانت نہ کرنے کی تاکید کرتا ہے کیوں کہ وہ نازنین اس کی امانت تھی۔

- تلاشِ بسیار کے بعد وہ نازنین شاہزادے کو ملتی ہے۔ اس کے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ کر شاہزادہ ملک صادق کا ذکر نہیں کرتا ہے خود تصویر دیکھنے کے بعد اپنے ہوش و حواس اور عیش و آرام کھونے کا ذکر کرتا ہے۔
- اندھا فقیر اپنی بیٹی کی کہانی الگ بیان کرتا ہے۔ اس کے ملک کا شاہزادہ اس کی بیٹی کو بغیر دیکھے اس کے حسن کی شہرت سن کر شادی کی پیش کش کرتا ہے۔ شادی کی تیاریاں دونوں طرف سے ہونے لگیں۔
- حسرت زدہ نامراد عاشق کی یہ کہانی عزم، ہمت، جرأت اور استقلال کی بدولت منزلِ مقصود کو پانے کے لیے ناکامی سے کامیابی کی جانب گام زن رہنے کی تلقین کرتی ہے۔
- تشنہ آرزوؤں سے مزین 'باغ و بہار' کا یہ حصہ تین سلطنتوں کا ماجرا بیان کر رہا ہے۔ قصے کا حالتِ بے کسی و بے بسی سے شروع ہو کر شادی کی تیاری پر ختم ہونا گرچہ مسرت و انبساط کی جھلکیاں پیش کرتا ہے لیکن فقیر کی مایوسانہ گفتگو میں تمناؤں کے منہدم ہونے کی داستان بھی پہلو بہ پہلو موجود ہے۔

آپ بتائیے

1. 'باغ و بہار' کا تعلق کس صنف سے ہے؟
2. 'باغ و بہار' کس کی تصنیف ہے؟
3. 'باغ و بہار' کہاں لکھی گئی؟
4. 'باغ و بہار' کس کتاب کا ترجمہ ہے؟
5. 'باغ و بہار' پر مصنف کو کتنے روپے کا انعام ملا تھا؟
6. 'باغ و بہار' کا سنہ اشاعت بتائیے۔
7. 'باغ و بہار' میں کتنے درویشوں کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے؟
8. کس کی خواہش پر میر امّن نے 'باغ و بہار' جیسی کتاب ترجمہ کی؟
9. اس اقتباس میں کن کن ملکوں کا ذکر ہے؟
10. شاہزادے کے والد اور ملک صادق کے درمیان کیا رشتہ تھا؟
11. شاہزادہ فقیر کو کتنی اشرفیاں دیتا ہے؟
12. اندھے فقیر کا تعلق کس ملک سے تھا؟

مختصر افسانہ

مختصر افسانے کو زندگی کی ایک قاش کہا گیا ہے۔ قصہ گوئی کی وہ مختصر صورت جس میں زندگی اختصار اور ایجاز کے ساتھ سما جائے، وہ صنف مختصر افسانہ ہے۔ مختصر افسانے کی ایک مشہور تعریف مغرب میں یہ کی گئی کہ وہ تحریری قصہ جسے ایک نشست میں پڑھ لیا جائے، مختصر افسانہ ہے۔ عام طور سے یہ تسلیم شدہ ہے کہ فکشن کی یہ سب سے مختصر شکل ہے جس میں قصہ، پلاٹ، کردار، نقطۂ عروج، زماں و مکاں جیسے تمام عناصر کے ساتھ ایک لازمی عنصر وحدت تاثر ہوتا ہے۔ کامیاب افسانے میں واقعات کی پیش کش میں وحدت تاثر یا واقعاتی مرکز پر اتحاد کے بغیر اچھا افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ اسی لیے بعض نقادوں نے اسے 'چاول پر قل ھواللہ' لکھنے کا فن قرار دیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے اردو میں سب سے پہلے مختصر افسانے کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا پہلا افسانہ 'نشے کی پہلی ترنگ' 1900 میں شائع ہوا۔ 1904 میں علی محمود کے افسانے 'چھانو' کی اشاعت ہوئی لیکن 1907 سے جب پریم چند کے افسانے منظر عام پر آنے لگے اور خاص طور سے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' (1908) ضبط ہوا، اس وقت اردو افسانے نے ایک نئی جست لی۔ پریم چند کے یہاں خیالی قصے کہانیوں میں ہم عصر زندگی اور سماج کے تمام ضروری مسائل شامل ہو گئے۔ حالاں کہ سجاد حیدر یلدرم اور ان کے بعض رفقا نے رومانی افسانے لکھنے کا سلسلہ قائم رکھا جن میں نیاز فتح پوری، ل۔ احمد، مجنوں گورکھ پوری، مرزا ادیب، حجاب اسمٰعیل اہم ہیں۔

پریم چند کے زیر اثر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ایک پورا قافلہ سامنے آیا۔ سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے 'انگارے' (1932) میں شامل ہوئے۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی نے آزادی سے پہلے ہی اردو افسانے میں اپنا مقام متعین کرالیا۔ احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، سید محمد محسن، اپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی اور غلام عباس جیسے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس عہد میں اپنا مقام بنایا۔ جدیدیت کے زمانے میں غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش وغیرہ نے جدید افسانے کی علامتی فضا قائم کی۔ 1970 کے بعد افسانے میں علامت نگاری کے عناصر کو کم کرتے ہوئے روایتی بیانیے کی طرف واپسی کو اہمیت دی گئی۔ اس انداز کے افسانے سب سے پہلے سلام بن رزاق نے لکھے۔ 1970 کے بعد جن افسانہ نگاروں کی واضح شناخت قائم ہوئی ان میں طارق چھتاری، سید محمد اشرف، شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد، شفق، انور خاں، ساجد رشید وغیرہ اہم ہیں۔ 1980 کے بعد خواتین افسانہ نگاروں میں غزال ضیغم اور ترنم ریاض نے اپنے امتیازات واضح کیے۔

اردو مختصر افسانے کی عمر بس ایک صدی کی ہے۔ ادب کی تاریخ میں سو برس ایک مختصر وقفہ ہے لیکن اس صنف نے اتنی ترقی کی جس کے سبب اردو کا دامن وسیع ہوا۔ وقت کے بدلنے کے ساتھ بہت طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور افسانے کے اطوار بھی بدلتے رہے لیکن پریم چند نے جس بیانیہ اور سادہ زبان کو افسانے کے لیے آزمایا تھا، وہ اردو افسانے کا سب سے کارگر ہتھیار ثابت ہوا۔ کم و بیش وہ زبان اور تکنیک اب بھی افسانہ نگاروں کے لیے سب سے مرغوب ہے۔

مجھے یہ خوش خبری لادے۔

- **نشان زد لفظوں کو غور سے پڑھیے۔**

''چھڑاوے۔ پاوے'' اور'' کھپادے۔ لادے'' ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ یہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ شاعری میں اس کا التزام ہوتا ہے۔ آج سے 150 سے 200 سال پہلے اردو نثر میں ایسے شاعرانہ انداز کا اچھا خاصا رواج تھا۔ جس نثر میں قافیوں کا استعمال ہو، اسے ''مقفّٰی'' نثر کہتے ہیں۔ میر امّن اگرچہ سادگی کو اہمیت دیتے ہیں لیکن ان کی نثر میں قوافی کا استعمال موجود ہے۔ یہ سلسلہ غالب کے خطوط تک قائم ہے۔ حالاں کہ یہ قافیے نثر کو شاعرانہ آہنگ نہیں عطا کرتے بلکہ میر امّن ہوں یا غالب، وہ انھیں روایت کے بہ طور استعمال کرتے ہیں۔

- **ان جملوں کو غور سے پڑھیے۔**

- کسو طرح تجھ کو ملک صادق کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم بیان کروں۔
- غالب ہے کہ وہ دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر، ایک بوزنہ جو باقی ہے تجھے دے۔
- اگر مجھے اس فکر سے چھڑاوے گا تو اس خدمت کے عوض بہت کچھ پاوے گا۔
- اور یہ بے چارہ تباہ ہو کر، اپنی سلطنتِ موروثی چھوڑ کر جان بچانے کے واسطے یہاں تلک آیا ہے۔

خط کشیدہ الفاظ کو غور سے پڑھیے، دیکھیے — کسو، کر کر، چھڑاوے، پاوے، تلک — یہ تمام الفاظ پرانی زبان میں استعمال ہوتے تھے لیکن اب انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔ زبان کی صفائی اور سلاست کا کام چلتا رہتا ہے۔ اسی عمل میں مذکورہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں پرانے لفظ اپنے آپ بدلتے گئے۔ ایسے لفظوں کو ادبی اصطلاح میں 'متروک' الفاظ کہتے ہیں۔ قدیم نثر یا شاعری پڑھتے ہوئے ایسے الفاظ بہ آسانی مل جاتے ہیں۔

آیئے، کچھ کریں

1. 'باغ و بہار' کو اپنی لائبریری سے نکال کر اس کا مطالعہ کیجیے۔
2. اردو کی دس داستانوں کی فہرست بنایئے اور انھیں تاریخی ترتیب سے لکھیے۔
3. 'باغ و بہار' کے علاوہ دوسری مقبول داستانوں کا مطالعہ اپنے استاد کی مدد سے کیجیے۔
4. شاملِ نصاب اقتباس میں سے قافیہ بند جملے اپنی کاپی پر لکھ کر استاد کو دکھایئے۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو 11 مئی 1912 کو موجودہ لدھیانہ (پنجاب) کے سمبرالہ گانو میں پیدا ہوئے۔ منٹو کے والد کا نام خواجہ غلام حسن تھا اور والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ امرت سر میں انھوں نے تعلیم حاصل کی لیکن انٹرنس سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ایک مختصر مدت کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ان کا داخلہ ہوا لیکن بیماری کی وجہ سے انھیں علی گڑھ چھوڑنا پڑا تھا۔

1933 میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس دوران وہ اخباروں میں کالم نویسی اور ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ مغربی ادب کے تراجم بھی انھوں نے شروع کر دیے۔ ان کا پہلا افسانہ امرت سر سے نکلنے والے رسالے 'خلق' کے اگست 1934 کے شمارے میں 'تماشا' عنوان سے شائع ہوا۔ انھوں نے صحافت کو شروع کے زمانے میں اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنایا۔ بعد میں فلمی دنیا سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا اور بہت ساری فلموں کی کہانی مکالمے یا منظر نامے انھوں نے قلم بند کیے۔ اپنی نگریا، چل چل رے نوجوان، بیگم، شکاری، پڑوسن، غالب، گھمنڈ اور آٹھ دن جیسی فلمیں منٹو کے قلم سے نکلیں۔ ان میں کئی اپنے زمانے کی نہایت مشہور فلمیں ہیں۔

منٹو اصلاً افسانہ نگار تھے اور ان کی شناخت بھی اسی حوالے سے قائم ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' ہے جو 1936 میں شائع ہوا تھا۔ 'دھواں'، 'چغد'، 'خالی بوتلیں خالی ڈبے'، 'نمرود کی خدائی'، 'سڑک کے کنارے'، 'اوپر نیچے اور درمیان'، 'سرکنڈوں کے پیچھے' وغیرہ ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ انھوں نے مختصر ترین افسانوں کا ایک مجموعہ 'سیاہ حاشیے' شائع کیا جس میں تقسیم ملک کا المیہ اور سیاسی اعتبار پہ جو لانیت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ منٹو نے ایک ناول لکھا جس کا نام بغیر عنوان کے ہے۔ خاکے اور ڈرامے بھی بڑی تعداد میں لکھے۔

1939 میں بیگم صفیہ سے ان کی شادی ہوئی۔ جنوری 1948 میں منٹو پاکستان چلے گئے۔ جہاں 18 جنوری 1955 کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ مختصر حیات کے باوجود منٹو نے بہت زیادہ لکھا اور ان کی مقبولیت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کتابوں کی ملک میں ہر زمانے میں نقلی اشاعتیں ہوتی رہیں۔ انگریزوں کی حکومت میں ان کے بعض افسانوں کو مقدمات کا نشانہ بنایا گیا۔ ان پر فحش گوئی کا الزام لگا۔ خاص طور سے ان کے افسانے 'بو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار'، 'دھواں'، 'کھول دو' اور 'اوپر نیچے اور درمیان' افسانوں پر مقدمات چلے۔

منٹو غیر روایتی فکر کے حامل افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سیاست ہو یا گھریلو زندگی، ہر جگہ بعض ایسے گہرے سوالات قائم کیے جن کی وجہ سے لوگوں کی پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ منٹو کے یہاں طنزیہ انداز بھی ان کے افسانوں کی کاٹ میں اضافہ کر دیتا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں میں اپنی بات مکمل کر لیتے تھے۔ بناوٹ اور تصنع سے انھوں نے اپنے افسانوں کو دور رکھا اور کہانیوں کے فطری انجام کو اوّلیت دی۔ یہ بات مشہور ہو گئی کہ منٹو کے یہاں مرد اور عورت کے رشتوں کی زیادہ کہانیاں ہیں لیکن ان کے یہاں سیاسی پیچ و خم سمجھنے کی صلاحیت بھی اسی قدر زبردست ہے۔ 'نیا قانون' سے لے کر 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' تک ان کے یہاں سیاسی افسانوں کی کوئی کمی نہیں۔ پریم چند کے بعد منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے مل کر اردو افسانے کی سب سے طاقت ور نسل سامنے آتی ہے۔

5STBPC-2018

سعادت حسن منٹو

مختصر افسانہ

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندستان کی حکومت کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندستان کے پاگل خانوں میں ہیں، انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں، انھیں ہندستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر اُدھر اونچی سطح پر کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چوں کہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے، اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے، سب کے سب پولس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی، تو بڑی دل چسپ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمین دار' پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے دوست نے پوچھا، 'مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟' اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا:

'ہندستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔'

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ سے پوچھا، 'سردار جی! ہمیں ہندستان کیوں بھیجا جا رہا ہے..... ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔'

دوسرا مسکرایا۔ 'مجھے تو ہندستوڑوں کی بولی آتی ہے — ہندستانی — بڑے — شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔'

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتے داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اور پہرہ دار سپاہی ان

پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں تک آپس میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بہ جائے بلڈی انڈین چپاتی توزہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ 'اوپڑدی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔' دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا، البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پانو سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ 'اوپڑدی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔'

لیکن بعد میں 'آف دی پاکستان گورنمنٹ' کی جگہ 'اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ' نے لے لی۔ اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاو میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیال کوٹ پہلے ہندستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندستان میں چلا جائے یا سارا ہندستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی۔؟ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا، اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے۔ اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندستان کی گڑ بڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند

رکھا۔'میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی..... تمھارے سب آدمی خیریت سے ہندستان چلے گئے تھے..... مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی..... تمھاری بیٹی روپ کور.....'

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔'بیٹی روپ کور'فضلِ دین نے رک رک کر کہا۔'ہاں..... وہ..... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے..... ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔'

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضلِ دین نے کہنا شروع کیا۔'انھوں نے مجھ سے کہا تھا، تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں..... اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندستان جا رہے ہو..... بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا اسلام کہنا..... اور بہن امرت کور سے بھی..... بھائی بلبیر سے کہنا فضلِ دین راضی خوشی ہے..... وہ بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے..... دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھے دن کی ہو کے مر گئی..... اور..... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں..... اور یہ تمھارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔'

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضلِ دین سے پوچھا۔'ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟'

فضلِ دین نے قدرے حیرت سے کہا۔'کہاں ہے یہ وہیں ہے جہاں تھا۔'بشن سنگھ نے پھر پوچھا پاکستان میں یا ہندستان میں؟'

'ہندستان میں..... نہیں نہیں پاکستان میں۔'فضلِ دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔'اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندستان آف دی درفٹے منہ!'

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں بن گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا، سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے میں ہندو سکھ پاگلوں سے بھری لاریاں پولس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں، متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیوں کہ اِدھر اُدھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے..... کوئی گالیاں بک رہا ہے، کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں، رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی..... پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ

پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائدِ اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے — یہ کہاں ہے۔ اس کا محلِ وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندستان میں۔ اگر ہندستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندستان اور ہندستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو ہندستان اور پاکستان کے نازک مسئلہ پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا — 'میں ہندستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں..... میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔'

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اتر گیا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس سی۔ پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعہ دار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا شروع کر دیا۔

چینوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم رکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علاحدہ علاحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہوگیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوگئی تھی گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندستان کے دو ٹکڑے کر دیے..... اس کی محبوبہ ہندستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل بُرا نہ کرے۔ اس کو ہندستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی

ہوگیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں، لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز واقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعہ دار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار اوپڑدی گڑ بڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ پاکستان اور ہندستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کریدن بہ دن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہم دردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔'' بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت وسماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو۔ مگر وہ بہت مصروف تھا، اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا۔

'اوپڑدی گڑ گڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح — جو بولے سونہال، ست سری اکال۔' اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو..... سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا۔ ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا، جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا۔ مگر سپاہیوں نے اسے روکا، یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمھارا دوست فضلِ دین ہے۔'

بشن سنگھ نے فضلِ دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضلِ دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ

چہ می گوئیاں - قیاس آرائیاں، رائے زنی

محلِ وقوع - وہ جگہ جہاں واقعہ ہو

یک لخت - فوراً

ساکت - بے حرکت، خاموش

صامت - چپ، خاموش

آپ نے پڑھا

- ٹوبہ ٹیک سنگھ افسانے کی کئی جہتیں ہیں۔ مگر یہاں دو بنیادی باتوں کی طرف توجہ کیجیے۔ پاگل خانے میں پہلی قسم ان پاگلوں کی ہے جو اپنے نفع نقصان کا سیدھا سیدھا حساب لگا رہے ہیں۔ مثلاً ہندو وکیل صاحب اپنی معشوقہ سے بچھڑنے کے غم میں پاگل ہوئے ہیں لیکن اپنی معشوقہ کے وطن اُمرت سر کے بجائے لاہور میں رہنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امرت سر میں ان کی پریکٹس نہیں چلے گی۔ یہاں محبت پر دولت بھاری پڑتی ہے۔ اس کی دوسری مثال ہم دو اینگلو انڈین پاگلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی فکر اپنے 'بریک فاسٹ' کو لے کر ہے۔ انھیں 'بلڈی انڈین چپاتی' نہیں چاہیے۔
- پاگلوں کی دوسری جماعت میں وہ لوگ ہیں جنھیں اپنی مٹی عزیز ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اہل وعیال ہندستان رخصت ہو چکے ہیں۔ سرحد پر پاگلوں کے باہمی تبادلے کا موقع ہے لیکن ایک پاگل (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کا ذہن و دل سیاسی تقسیم کو قبول نہیں کر پاتا اور دونوں ملکوں کے درمیانی حصّے (No Mans Land) میں وہ دم توڑ دیتا ہے۔
- اس مفاد کی جنگ میں وحشیوں نے نہ جانے کون کون سے مظالم ڈھائے لیکن دو مختلف قوم سے تعلق رکھنے والوں کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ فضلِ دین اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ملاقات کو اسی نظریے سے دیکھنا چاہیے۔
- برصغیر ہندو پاک کی پوری تصویر اس افسانے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ منٹو ایک جگہ لکھتے ہیں :
- ''پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔''
- کیا ہمارے سیاسی دانش وروں کے ذہن میں پاگلوں جیسا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکا؟ ایک ملک کو دو حصّوں میں بانٹ کر سرحد کی دیواریں ضرور قائم کر دی گئیں لیکن اکثریت اب بھی یہ سمجھ پانے میں ناکام ہے کہ ''انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔''

آپ بتائیے

1. ٹوبہ ٹیک سنگھ کس شے کا نام ہے؟
2. لاہور پاگل خانے کے ہندو اور سکھ پاگل کہاں بھیجے جا رہے تھے؟

3. اس پاگل کا نام بتایئے جس نے اپنے متعلق محمد علی جناح ہونے کا اعلان کر دیا تھا؟
4. ٹوبہ سنگھ کا اصل نام کیا تھا؟
5. ٹوبہ ٹیک سنگھ کی موت کس جگہ ہوئی؟

مختصر گفتگو

1. پاگلوں کے باہمی تبادلے کے لیے کون سا فارمولا استعمال کیا گیا؟
2. پیڑ پر چڑھے پاگل نے کس مسئلے پر تقریر شروع کی؟
3. اپنے آپ کو خدا کہنے والے پاگل سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کیوں ناراض ہو گیا؟
4. پاگل خانے کے وہ لوگ جن کا ذہنی توازن بالکل درست تھا، کس پریشانی میں گرفتار تھے؟
5. ٹوبہ ٹیک سنگھ اپنے ملاقاتیوں کے آنے سے قبل کس طرح تیار ہوتا تھا؟

تفصیلی گفتگو

1. ٹوبہ ٹیک سنگھ افسانے کی روشنی میں لاہور پاگل خانے کی تفصیل قلم بند کیجیے۔
2. پاگلوں کے سیاسی شعور کو احاطۂ تحریر میں لایئے۔
3. ٹوبہ ٹیک سنگھ کے کرب کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
4. تقسیمِ ملک سے کون کون سی الجھنیں پیدا ہوئیں؟ ٹوبہ ٹیک سنگھ افسانے کی روشنی میں بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. تقسیمِ ہند کو موضوع بنا کر لکھے گئے چند افسانے جمع کیجیے۔
2. ملک کے بٹوارے کے بعد پاکستان ہجرت کرنے والے ادیبوں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اُس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے..... پاکستان میں یا ہندستان میں؟'

متعلقہ افسر ہنسا۔ "پاکستان میں۔"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے..... اور زور زور سے چلّانے لگا۔ 'اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔'

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندستان میں چلا گیا ہے..... اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا۔ مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز پر اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں میں کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چوں کہ بے ضرر تھا، اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی..... اِدھر اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برسوں تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے..... اُدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندستان تھا..... اِدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

لفظ و معنی

تبادلہ - ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا

دانش مند - عالم، سمجھ دار

لواحقین - رشتے دار، بھائی بند

جیلانی بانو

جیلانی بانو 14 جولائی 1936 کو بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد علامہ حیرت بدایونی نے ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد کی مستقل سکونت اختیار کی تو یہ حیدرآبادی ہوگئیں۔ ان کے والد اردو اور فارسی کے شاعر کے ساتھ ساتھ عالمِ دین بھی تھے۔ انھوں نے اپنے سات بچوں کی پرورش میں خصوصی دل چسپی لی۔ ..

جیلانی بانو کی تعلیم ایم۔اے۔تک ہے۔ انھوں نے بیش تر امتحانات پرائیویٹ ہی پاس کیے۔ ابتدا میں انھوں نے صبا بدایونی کے نام سے شاعری کی۔ انھیں موسیقی اور مصوری کا بھی شوق رہا لیکن وہ افسانہ نگار اور ناول نگار کے طور پر مشہور ہوئیں۔ 1959 میں ان کی شادی مشہور ادیب ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔

'روشنی کے مینار'، 'نروان'، 'پرایا گھر'، 'رات کے مسافر'، 'روز کا قصہ'، 'یہ کون ہنسا'، 'تریاق'، 'نئی عورت'، 'سچ کے سوا'، 'بات پھولوں کی' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ایوانِ غزل' اور 'بارشِ سنگ' ان کے ناولوں کے نام ہیں۔ 'نغمے کا سفر' اور 'جگنو اور ستارے' ان کے ناولٹ ہیں۔ انھوں نے کرشن چندر پر مونوگراف بھی لکھا ہے۔ بچّوں کے ادب اور تراجم سے بھی ان کی دل چسپی رہی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کی تخلیقات کے ترجمے ہوئے۔ انھیں مودی غالب ایوارڈ، کل ہند قومی حالی ایوارڈ، نقوش ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ وغیرہ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ وہ آج بھی اپنے تخلیقی کاموں میں پوری طرح سرگرم ہیں۔

پرَامس

'امو، امو، ابھی آپ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔'

'ہم سمجھے کہ..... کہ.....' امو کے آس پاس کھڑے ان کے تینوں بیٹے، ان کی بیویاں، ان کے بچے، سب گھبرا گئے..... امو زندہ ہیں۔ ہم سمجھے کہ..... کہ.....' ہم نے ان کے مرنے کا دکھ کتنی آسانی سے سہہ لیا..... امو سب کی طرف بڑے دکھ کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے نے کتنی جلدی سفید کپڑا ڈال کر امو کا منہ چھپانا چاہا..... اگر امو ہاتھ اٹھا کر چادر نہ ہٹا دیتیں تو شاید وہ سب دوسرے کمرے میں جا کر انھیں دفن کرنے کی تیاری شروع کر دیتے۔

وہ سب نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے امو نے دیکھ لیا کہ ان کے مرنے پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلے گا۔

دو برس ہو گئے۔ جب ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کینسر امو کے سارے بدن میں پھیل گیا ہے۔ کسی بھی وقت انھیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب سے یہ بات ان کی دونوں بہوؤں نے سنی تھی، وہ امو کا زیادہ خیال کرنے لگی تھیں۔ ہر مہینے فون پر امو کی خیریت پوچھتیں۔ دوسری بہو امریکی تھی۔ وہ انڈیا کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی وہ ہر سال آتی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتی تھی۔ حیدر آباد کی سیر و تفریح سے فرصت ملتی تو کسی دن امو کی مزاج پرسی بھی کر لیتی تھی۔ تینوں بیٹے ان کے علاج کے لیے بڑی پابندی کے ساتھ ڈالر اور ریال بھیجتے تھے۔ امو کے لیے بہت اچھا ڈاکٹر، بہترین علاج۔ گھر میں ہر طرح کا آرام۔ دن رات خدمت کرنے والی خولجہ بی، جسے دور بیٹھی بہوئیں انعام اکرام سے نوازتی رہتی تھیں۔

شکاگو میں ایک دن صبح سویرے خولجہ بی کا فون آیا۔ بیگم صاب کی طبیعت بھوت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب بولے، ان کے بیٹوں کو فون کر دو۔ سب کو جلدی آ جاؤ بولو۔'

اس فون سے ہمارے گھر میں ہل چل مچ گئی۔ سب کے پروگرام ڈسٹرب ہو گئے۔ افوہ امو ہمیشہ اسی طرح پریشان کرتی ہیں۔ بھلا یہ کوئی موسم ہے انڈیا جانے کا۔ گرمی کے مارے مر جائیں گے ہم سب۔ ان کی بہو نسیم گھبرا گئی۔

ہیلو..... ہیلو.....

چاروں طرف سے فون آنے لگے.....

نیویارک سے جمشید کہہ رہا تھا۔

'بھائی جان! خولجہ بی کا فون آیا ہے کہ چوبیس گھنٹے..... لیکن مجھے اس وقت لیو لینا بہت مشکل ہے۔'

'لیکن جمشید! تمھیں یاد ہے کہ ہم سب نے امو سے پرامس کیا تھا کہ ہم چاروں بھائی مل کر ان کی ڈیڈ باڈی اٹھائیں گے۔ اس لیے ہمیں جانا پڑے گا۔ رشید نے اسے سمجھایا۔ پھر ممبئی سے تیسرے بھائی خورشید کا فون آیا۔

'بھائی جان۔ ہم سب مل کر امریکہ تفریح کرنے جا رہے تھے۔ اب نشی کو بھی ساتھ لے جاؤں تو انڈیا میں گرمی بہت ہوگی۔ آپ وہاں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارے لیے ریزرویشن کرا دیجیے۔

'ہاں بھئی، میرے بھی اس موسم میں انڈیا جانا بہت مشکل ہے۔'

'امو اچھی بھلی ہوں گی۔ ذرا دل گھبرایا تو خواجہ بی سے فون کروا دیا ہے۔'

'خورشید! میں نے ابھی ڈاکٹر عارف سے بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے.....'

'تو پھر میں آجاؤں گا۔ دہلی کے ایک سیمینار کا انوی ٹیشن بھی آیا ہے۔'

'ارے پھر تو ہم ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے نا ڈیڈ..... پنکی نے خوش ہو کر کہا۔

'ہاں بے بی۔ ہم چاروں بھائیوں نے امو سے پرامس کیا ہے کہ ہم ان کی ڈیڈ باڈی.....'

'آفٹر ڈیتھ.....؟'

بے بی نے منہ بنا کر کہا۔ 'گرینڈ مم نے اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ زندگی ان جوائے کرنے کا کوئی پرامس کیوں نہیں لیا.....؟'

الجھی سانسوں کے درد کو دل میں تھامے۔ یہی بات امو بھی سوچ رہی تھیں..... سنسان گھر..... خالی کمرے..... سونا آنگن..... اندھیرے کمرے میں اکیلی لیٹی وہ درد سے تڑپ رہی تھی، کسی دوا کا اثر نہیں ہوتا۔ بدن کا کوئی حصہ قابو میں نہ تھا۔ کانپتے ہاتھ سے پانی کی بوتل اٹھانے کی کوشش کرتیں تو سارا بستر بھیگ جاتا۔ 'پانی..... پانی..... خواجہ بی..... خواجہ بی کہاں مر گئی.....؟ کس کا فون آیا..... دروازے پر کون آیا ہے.....؟'

خواجہ بی کمرہ بند کیے اپنے میاں کے ساتھ سوتی رہتی تھی۔ بڈھی کو چلانے کی عادت ہوگئی ہے۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی یہاں۔ کوئی دوسری نوکری ڈھونڈو جی اب۔

تو ان کے میاں کی وکالت بس یوں ہی چلتی تھی۔ مگر امو نے جائیداد بیچ کر چاروں بیٹوں کو ڈاکٹر، انجینئر بنا دیا۔ اچھی ڈگریاں ملتے ہی ان سب کے پنکھ نکل آئے اور انھوں نے امریکہ کی طرف پرواز کی ٹھانی..... امو کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ اتنی دور۔ اللہ میاں کے پچھواڑے.....؟ ہم سب امریکہ میں جا بسیں گے.....؟'

'ہم سب.....؟ تمھیں کون لے جائے گا امریکہ؟ بچوں کے ابا نے ہنس کر کہا تھا۔ امریکہ میں ماں باپ نہیں رہتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کا ملک ہے۔'

'اچھا.....؟ تو ماں باپ کہاں جائیں؟' اموں نے تعجب سے پوچھا تھا۔

'کوڑے کی ٹوکری میں.....؟ ابا نے خفا ہو کر کہا تھا۔

دیوان گھر کے آنگن میں بیٹھی، کبوتروں کو دانا ڈالتے میں اموسوچتی تھیں کہ کوڑے کا ڈھیر ہی بن گیا ہے یہ گھر۔ بار بار لائٹ چلی جاتی ہے۔ اندھیرے میں ماچس نہیں ملتی۔ پوسٹ مین کوئی خط پھینک جائے تو وہ کسی کیاری کے پیچھے پڑا مہینوں کے بعد ملتا ہے۔ ویسے بھی ان کے بیٹے اب خط لکھنے کی پرانی رسم بھول چکے تھے۔ کبھی ضرورت ہوتی تو فون کر لیتے ہیں۔ دودھ والا دودھ پھاٹک پر رکھ کر چلا جاتا ہے تو روز کتا اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کبھی آنگن میں کسی بچے کی گیند گر جائے تو وہ اندر آنے سے پہلے اموکی صورت دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ رشتے داروں کو فرصت نہیں ملتی آنے کی۔

کتنی بار وہ فون پر کہتی تھیں۔

'رشید اب میں تمھارے پاس آجاؤں گی مجھے روز بخار آجاتا ہے۔ کھانسی بہت بڑھ گئی ہے۔ اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہے۔'

مگر اموآپ کی بیماری کا علاج یہاں بہت مہنگا ہے۔ گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ آپ کی دیکھ بھال کیسے ہوگی؟ رشید اموکو اپنی مجبوری سناتا تھا۔

'اچھا پھر پنکی اور طارق سے کہو مجھ سے فون پر بات کریں۔ بچوں کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے میرا.....' بچوں کو یاد کر کے انھیں رونا آجاتا تھا۔

'وہ بات یہ ہے اموکہ بچوں کو اردو نہیں آتی۔ اس لیے وہ آپ کی بات نہیں سمجھ سکتے۔' اموفون رکھ دیتیں۔ میری بات کوئی نہیں سمجھتا۔ نہ بچے نہ ان کے ماں باپ.....

جب تینوں بھائی امریکہ گئے تو اموابا کے پاس حمید کو چھوڑ گئے تھے۔ حمید کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ سارا دن نکمے دوستوں کے ساتھ گھومتا۔ کبھی اسٹوڈنٹس یونین کا جھنڈا تھامے سڑکوں پر گھوم رہا ہے تو کبھی کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ نعرے لگا رہا ہے۔ پھر ایک دن سنا، وہ کسی پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔

'تمھارے امتحان میں ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ اسٹڈی کیوں نہیں کرتے؟' ابا اسے بار بار یاد دلاتے تھے۔

'ابا میں اس سال امتحان نہیں دوں گا۔ مجھے الیکشن کا کام کرنا ہے۔'

ابا بہت خفا ہوئے۔ اموں نے رو رو کر سمجھایا۔ مستقبل کے بھیانک نقشے کھینچے، جب زندگی بھر بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ مگر حمید اب گھر بہت کم آتا تھا۔ پھر خبر آئی کہ کسی مخالف پارٹی کے ممبر کو مارنے کے جرم میں حمید گرفتار ہو گیا ہے۔

سنا ہے وہ آدمی ہاسپٹل میں مر گیا.....

سارے محلّے کے لوگ ابّا امو کو پرسہ دینے آئے۔ جانے کون سے گناہ کی سزا ملی کہ حمید اس گھر میں پیدا ہوا۔ اب اسے پھانسی کی سزا ملے گی۔ دوست رشتے دار تعزیت کے لیے آنے لگے۔

'پھانسی پر چڑھیں گے حمید کے دشمن، اب وہ تو ہمارا ہیرو ہے۔ حمید کے دوست کہہ رہے تھے۔ ان کی پارٹی اکثریت میں آ گئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں تک اس مقدمے کی کاروائی چلتی رہی۔ پھر معاملہ ٹھپ ہو گیا۔ ایک دن حمید کا ایک دوست آیا تو اس نے امو سے کہا۔ 'کوئی ورکر دو چار مرڈر کر ڈالے تو پارٹی اسے الیکشن کا ٹکٹ دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔'

وہی ہوا۔ حمید کے گناہوں کی لمبی لسٹ نے اسے اپنی پارٹی کا سب سے اہم لیڈر بنا دیا۔

'اب دیکھتا ہوں کہ ہمارے حلقے کا کون ووٹر ہے جو مجھے ووٹ دیے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ امو اور ابا دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔

جب گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ایک جلوس کے ساتھ حمید گھر آیا۔ ابا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ ابا سے گلے ملنے کے لیے جھکا تو ابا نیچے گر پڑے.....

پھر حمید منسٹر بن گیا اور ضد کی۔ امو میرے ساتھ دہلی چلیے۔ سرکاری بنگلے میں رہنا، گورنمنٹ کے جھنڈے والی کار میں گھومنا، خوب ٹھاٹ کرنا۔ امو نے منسٹر کی امّی بننے کے لیے کئی نئے جوڑے سلوائے، نئی چپّل خریدی۔ مگر وہ منسٹر کے بنگلے میں فٹ نہ ہو سکیں۔ نوکروں سے گوشت ترکاری کا حساب مانگتیں۔ چوکیدار اور ڈرائیور کے سلاموں کے جواب میں جیتے رہو، سلامت رہو کہہ کر خوش ہوتیں۔ بنگلے کے لان میں دھوپ کے رخ کھاٹ ڈال کر پاپڑ سکھانے بیٹھ جاتیں۔ چنانچہ منسٹر کی بیگم نے انھیں پھر وہیں بھیج دیا جہاں وہ سر جھکائے اچار مربے بنانے میں جٹی رہتیں۔

تین دن ہو گئے۔ سب امو کے آس پاس ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ بار بار آکسیجن کا ٹیوب ٹھیک کرتے۔ امو کو کچھ ہونے والا ہے۔ اس آنے والے دکھ کو وہ اپنے چہروں پر پینٹ کر چکے تھے۔ امو بڑی مشکل سے آنکھ کھول کر سب کو دیکھتیں۔ حمید نہیں آیا..... میرا حمید..... شاید امو کا دم حمید میں اٹکا ہوا ہے.....

خواجہ بی کہہ رہی تھی کہ حمید دہلی میں ہے۔ اس بار اس کی پارٹی کو الیکشن میں اکثریت نہیں ملی۔ اب حمید منسٹر نہیں رہے گا۔ ایسے وقت میں وہ دہلی سے باہر کیسے جا سکتا ہے؟

'مگر ہم سب نے امو سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے آخری وقت..... رشید بہت غصے میں تھا۔ امو بار بار آنکھیں کھولتیں۔

'تم سب کو اپنے پاس دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے کہ بچوں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پلاؤ کھلاؤں۔'

'اس وقت بھی امو کا دل پلاؤ میں اٹکا ہے۔ اللہ توبہ.....' ان کی بڑی بہو نے ان کے گالوں کو چھو کر امو سے کہا۔

'امو۔ یٰسین پڑھیے۔ اللہ کو یاد کیجیے۔'

'میرا حمید۔ اب میرے جنازے کو کاندھا دینے.....' وہ پھر رونے لگی۔ ''تم سب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے جنازے کو چاروں بھائی مل کر اٹھاؤ گے۔'

'ہیلو ہیلو۔ اب امو کا کیا حال ہے.....؟' حمید کا دہلی سے فون آ گیا۔ 'کیا.....؟ آکسیجن دی جا رہی ہے۔ مگر اب آکسیجن دینے سے کیا فائدہ۔ جب ڈاکٹر کہہ چکا ہے کہ..... بھائی جان میری بات سنیے۔ اگر خدانخواستہ امو کو آج رات کچھ ہو گیا تو پرائم منسٹر مجھے پرسہ دینے آئیں گے۔ لیکن پرسوں ہماری منسٹری ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے آپ امو کو فوراً کسی اچھے شاندار ہاسپٹل میں لے جائیے۔ انتقال کی نیوز ٹی۔ وی۔ پر آئے تو اس ہاسپٹل کا نام بھی ہونا چاہیے۔'

پھر اس نے کہا۔ 'ذرا بھابھی کو فون دیجیے۔'

'ہیلو بھابھی! سب انتظام اچھا کیجیے۔ خرچ کی فکر مت کرنا۔ ممکن ہے ٹی۔ وی۔ والے بھی اپنی نیوز میں شامل کرنے کے لیے گھر پر آئیں۔'

'آپ فکر نہ کریں حمید بھائی۔ میں نے سب انتظام کر دیا ہے۔' بھابھی نے اطمینان دلایا۔ 'کیا کہہ رہا ہے حمید؟ کب آ رہا ہے وہ؟' امو نے ڈوبتی سانسوں کو روک کر کہا۔

تب ڈرائنگ روم میں جا کر خورشید نے کہا۔

'کل مجھے دہلی میں ایک سمینار اٹینڈ کرنا ہے'

'اور میں صرف تین دن کی لیو لے کر آیا تھا'۔

'بچے گرمی سے گھبرائے جا رہے ہیں۔' امریکن بہو نے منہ بنا کر کہا۔

صبح سویرے اموکی آنکھ کھلنے سے پہلے وہ سب چپکے چپکے گیٹ کے باہر نکلے۔انھوں نے خواجہ بی کو اموکی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کی ہدایت دی اور بہت سے ڈالر، ریال، روپے اس کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

'اموکی خیریت کے لیے ہمیں فون کرتی رہنا۔ بائی۔ بائی.....'

خواجہ بی اندر آئی اور یہ دیکھ کر ڈر گئی کہ اموکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔شاید انھوں نے اپنے بیٹوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پھر اس نے ایک دکان کا فون نمبر ملایا۔

'ہیلو.....میت لے جانے والی ایک لاری بھیج دیجیے اور ساتھ میں چار آدمی بھی ہوں۔اور کچھ نہیں چاہیے۔ان کے لڑکے ہر چیز کا انتظام کر گئے ہیں۔'

لفظ و معنی

پرامس (Promise) ۔ وعدہ کرنا

مزاج پرسی ۔ خیریت پوچھنا، حال چال دریافت کرنا

تفریح ۔ طبیعت بہلانے کے لیے

پرواز ۔ اڑان

مستقبل ۔ آنے والا زمانہ

مخالف ۔ مقابل، دشمن

تعزیت ۔ پُرسہ دینا، موت کے بعد دلاسہ دینے کے لیے آنا

اٹینڈ (Attend) ۔ شریک ہونا

آپ نے پڑھا

- جیلانی بانو اردو افسانہ نگاری کا ایک اہم نام ہے۔اردو ادب میں جن خواتین نے اپنی بھرپور چھاپ چھوڑی ہے، اس میں جیلانی بانو کا تذکرہ ناگزیر ہے۔
- اس افسانے میں ایک ایسی ضعیف ماں کی کہانی بیان ہوئی ہے جو دو برس سے بسترِ علالت پر پڑی ہوئی ہے۔کینسر اس کے سارے بدن میں پھیل گیا ہے۔کسی بھی وقت وہ موت کی آغوش میں جا سکتی ہے۔ہندستان میں مقیم ایک بیٹے کو چھوڑ کر امریکہ میں بسے اس کے بقیہ تینوں بیٹے اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ اس کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آ گئے ہیں کہ وہ اس کے جنازے کو کاندھا دیں گے۔مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔کاندھا دینے والا اس کا آخری بیٹا ہندستان میں رہتے ہوئے بھی اپنی

سیاسی مصروفیت کے سبب شدید انتظار کے باوجود نہیں آتا۔ اس کے اپنوں کو اپنی ہی پڑی ہے۔ دل سے نہیں چاہنے کے باوجود محض دباؤ اور ماں سے دکھاوے کی محبت نباہنے کی اپنی اپنی کوشش میں یکے بعد دیگرے وہ سب بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی میں بیان کیے گئے واقعات اور ادا کیے گئے مکالمات سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ موت کے ہاتھوں میں جھول رہی ماں سے اس کے بیٹوں کے رشتے میں کھوکھلا پن، تصنع، ریاکاری بلکہ مکاری آ گئی ہے۔ اس عہد کے مادّہ پرست، جاہ طلب اور آسائش پسند ماحول نے ماں جیسے مقدّس رشتے کے لیے ان کے دلوں سے محبت و احترام جیسی اعلا انسانی قدروں کو چھین کر رکھ دیا ہے۔ وہ حد درجہ سفّاک، بے درد اور بے رحم بن چکے ہیں۔ ماں کی موت واقع نہیں ہوئی اور اسے نزع کے عالم میں ہی چھوڑ کر چپکے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

- جیلانی بانو کا یہ افسانہ کردار اساس ہے۔ یعنی وہ کردار کی زندگی کے تجربے کو دکھانا اور اسی کے حوالے سے اس عہد کے سماجی رشتوں کی سچائی کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ یہ سچائی چاہے کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔
- اس افسانے کا مرکزی کردار ماں ہے۔ وہ شوہر کی موت کے بعد کسی بھی بیٹے کے ساتھ نہیں رہ پاتی ہے۔ ان کے بیٹوں نے جان بوجھ کر چند بہانوں کا سہارا لے کر اسے آبائی گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اپنے جسمانی آزار کو سہتی ہوئی وہ اپنے دلی درد کو بھی جھیلتی رہتی ہے۔ کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ بیٹوں کے تئیں اس کی فطری محبت کی قدر کرنے والا نام بھر کوئی نہیں۔ موت کی سیج پر وہ جاں کاہ حقیقت کا احساس ساتھ ہی اس کا عرفان بھی حاصل کرتی ہے۔ افسانے کی ابتدا اور اس کے آخر میں ظاہر کیا گیا اس کا عمل حقیقت کے عرفان کے عین مطابق ہے۔ اس کے دوسرے پیراگراف اور آخری حصے سے دو پیراگراف پہلے کے ان جملوں سے ماں نے عرفان پا لیا ہے، اس کا پتہ چلتا ہے:

(i) 'وہ سب نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے امّو نے دیکھ لیا کہ ان کے مرنے پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلے گا۔'

(ii) 'خواجہ بی اندر آئی اور یہ دیکھ کر ڈر گئی کہ امّو کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید انھوں نے اپنے بیٹوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔'

- یہ افسانہ جیلانی بانو کے فن کی پہچان کراتا ہے۔ اس میں ماں کی کہانی کو بیان کرنے میں حد درجہ فن کارانہ ضبط اور تحمل سے کام لیا گیا ہے۔ ماں کے کردار کا امٹ نقش اور اس کے درد سے قاری کا اٹوٹ رشتہ بنانے میں یہ افسانہ بے حد کامیاب ہے۔

آپ بتائیے

1. جیلانی بانو کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. جیلانی بانو کے ایک افسانے کا نام بتائیے۔
3. جیلانی بانو کے دو ناولوں کے نام بتائیں۔
4. افسانہ 'پرامس' کا مرکزی کردار کون ہے؟

5. 'پرامس' افسانے کے دو کرداروں کے نام بتایئے۔
6. کینسر کا مرض کس کے سارے بدن میں پھیل گیا تھا؟
7. خواجہ بی کون تھیں؟
8. 'گرینڈ مم نے اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ زندگی ان جوائے کرنے کا کوئی پرامس کیوں نہیں لیا؟' یہ بات کس نے کہی؟
9. امو نے اپنے بیٹوں سے کیا پرامس لیا تھا؟
10. 'امو یٰسین شریف پڑھیے۔ اللہ کو یاد کیجیے۔' یہ بات کس نے کب کہی؟

مختصر گفتگو

1. امو کے ایک بیٹے حمید کے بارے میں بتایئے۔
2. امو کے چاروں بیٹوں کے نام اور ان کے کام بتایئے۔
3. امو دکھی کیوں تھیں؟
4. امو کے بیٹوں نے ان کی موت کے وقت ساتھ کیوں نہیں دیا؟

تفصیلی گفتگو

1. افسانہ 'پرامس' کی روشنی میں آج کے عہد کے انسانی رشتوں پر اظہارِ خیال کیجیے۔
2. 'پرامس' افسانے کی تلخیص پیش کیجیے۔
3. 'پرامس' افسانے کی روشنی میں جیلانی بانو کی کردار نگاری کو واضح کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. یہ کہانی ڈرامے کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اپنے استاد اور دوستوں کی مدد سے اسے اسٹیج پر دکھایئے۔
2. آپ کے محلّے میں اگر کوئی ایسی ضعیف ماں ہے، جسے چھوڑ کر اس کے بیٹے چلے گئے ہیں، تو ایسی ماں سے مل کر اس کے خیالات اور احساسات کو جاننے کی کوشش کیجیے۔

شفیع جاوید

شفیع جاوید مظفر پور میں 4 جنوری 1935 کو پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ آبائی وطن گیا ہے۔ ان کا اصل نام سیّد محمد شفیع الدین ہے۔ پٹنہ یونی ورسٹی سے انھوں نے سماجیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ محکمہ اطلاعات ونشریات، حکومتِ بہار کے ڈائرکٹر کے عہدے سے وہ سبک دوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران گورنر بہار کے پریس سکریٹری، بیس نکاتی پروگرام عمل درآمد کمیٹی کے ڈائرکٹر اور انڈین ریڈ کراس سوسایٹی، بہار کے ایڈمنسٹریٹر جیسے عہدوں پر بھی وہ کار بند رہے۔ فی الوقت وہ پٹنہ میں مقیم ہیں۔

1953 میں دربھنگہ کے ماہنامہ 'افق' میں شفیع جاوید کا پہلا افسانہ 'آرٹ اور تمبا کو' شائع ہوا۔ 'دائرہ سے باہر' (1979)، 'کھلی جو آنکھ' (1982)، 'تعریف اس خدا کی' (1984)، 'وقت کے اسیر' (ہندی، 1991) اور 'رات، شہر اور میں' (2004) ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے مِنی کہانیاں اور کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ گنگا ندی کے تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کے علاوہ اردو فکشن کے توسط سے آزاد ہندستان کے سیاسی اور سماجی عوامل کی تلاش وجستجو کے موضوع سے ان کی تحقیقات بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ انھیں بہار اردو اکادمی اور آل انڈیا میرا کادمی، لکھنؤ کی طرف سے اعزازات بھی حاصل ہو چکے ہیں۔

ماضی کی رومانوی یادیں شفیع جاوید کی افسانوی فکر کا اصل محور ہیں۔ ماضی کو عصرِ حاضر سے نیم فلسفیانہ انداز میں جوڑتے ہوئے وہ اپنے افسانوں میں اس عالم گیر سوز کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے پورا معاشرہ الجھا ہوا ہے۔ ان کے افسانوں میں تھوڑے وقفے سے حال اور ماضی کے ملنے اور رخصت ہونے کی کیفیت چلتی رہتی ہے۔ اسے وہ فلش بیک (Flash Back) یا کبھی شعور کی رو تکنیک سے سنبھالتے ہیں۔ ان کی زبان افسانوی فکر کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے لیکن اس میں موجود انشا پردازانہ عناصر ان کے مخصوص اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک شاعرانہ انداز ہے جو اُن کے افسانوں میں رومانی لہر کو تیز کرتا رہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بعد کی نسل میں اس اسلوب کے غالباً وہ تنہا وارث ہیں۔

شفیع جاوید

مختصر افسانہ

بھولے بسرے گیت

سیّد عزیز احمد کو ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تقریباً دس سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ جب تک وہ اپنے محکمے میں آتے جاتے رہے، وہاں لوگوں نے اور ماتحتوں نے انھیں یاد رکھا، کچھ ان کے پانو بھی چھو لیتے اور کچھ احترام کے ساتھ سلام کرتے۔ جب ان کے پاس اپنی گاڑی نہ رہی تو لوگوں سے ملنا ملانا بھی کم ہو گیا۔ جو بھولے بھٹکے یاد کر لیتے تھے، وہ بھی ختم ہوا، تھوڑی سی پہچان باقی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ سب سے پہلے لوگ یہ بھولے کہ کبھی وہ ڈائرکٹر جنرل تھے۔ پھر لوگوں نے یہ بھلایا کہ وہ سیّد زادے بھی تھے۔ اس میں ان کا اپنا بھی قصور تھا۔ اوّل تو یہ کہ وہ گوشہ نشیں ہو گئے، مستزاد یہ کہ اپنے مکان کے باہر انھوں نے اپنے نیم پلیٹ پر صرف عزیز احمد لکھوایا تھا۔ تیسرے مرحلے میں لوگ یہ بھولے کہ وہ کبھی عزیز احمد بھی تھے۔ اب وہ صرف چاچا یا نانا جان رہ گئے تھے۔ لوگوں کی قلیل المدت یادداشت میں سیّد عزیز احمد کی اب کوئی جہت باقی نہ تھی۔

اب وہ اکیلے ہوتے (جو وہ اکثر ہوا کرتے تھے) تو انھیں بہت سی گزری باتیں یاد آتیں۔ خاص طور سے اپنی وجاہت اور اپنا رُتبہ، اور اپنا عہدہ کہ انھیں وہ آنکھیں بند کر کے پرانی فلموں کی طرح بڑی خاموشی سے دیکھا کرتے۔ اب بیٹھے بیٹھے وہ اونگھ بھی جایا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا کہ ٹیلی ویژن پر ''لو آن انٹرنیٹ'' ان کا نوجوان نواسہ دیکھ رہا تھا۔ صوفہ پر اس کے بازو میں بیٹھ کر خبروں کو سننے کے انتظار میں وہ اونگھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی آنکھ کھلی تو اسکرین پر منظر بدلا ہوا تھا۔ آگ لگی ہوئی تھی، شعلوں کی لپٹ اونچی سے اونچی ہو رہی تھی اور سائے ایک دوسرے میں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ کوشش کے باوجود ان کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو انھوں نے اپنے نواسے سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے بیٹا؟'' نواسہ کچھ نہیں بولا۔ بس خاموشی سے اٹھ گیا۔ انھیں تعجب ہوا۔ آج سے پہلے کبھی نواسے نے اس طرح خاموشی سے ان کے سوالوں کو ٹالا نہیں تھا۔ اس کی یہ چُپّی انھیں بری تو لگی لیکن وہ چپ رہے کہ اب خاموش رہنے اور اکیلے ہی رہنے میں عافیت تھی۔ ٹی۔ وی۔ چلتا رہا۔ وہی منظر دوبارہ اسکرین پر آیا تو بات انھیں کچھ سمجھ میں آئی اور لاحول پڑھ کر بڑی تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد نواسہ خاموشی سے واپس آکر وہاں بیٹھ گیا اور اس طرح کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔

گھبرا کر عزیز احمد مکان سے باہر نکل آئے۔ اندر انھیں گہری گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ یوں بھی وہ کُھلے کے عادی تھے۔ ہمیشہ بڑے بڑے بنگلوں میں رہتے اور وسیع لان میں چہل قدمی کرتے آئے تھے۔ لیکن اپنا مکان بڑا نہیں بنوا سکے کیوں کہ بالائی آمدنی کو گناہ سمجھتے رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں جو کچھ ملا، وہ ان کی بیماری اور آپریشن پر خرچ ہو گیا۔ اب اس چھوٹے

سے مکان کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ قلیل سی پنشن سے وہ اور ان کی اہلیہ بس روٹیاں کھا لیتے تھے۔ باہر کی کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا میں انھیں راحت کا احساس ہوا اور انھوں نے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا تو انھیں عجیب سا لگا کہ وہ اتنے چھوٹے سے کمرے میں رہتے ہیں اور ان کا چہرہ مُرجھا گیا۔ اب وہ ویسے نہیں رہ گئے تھے حالاں کہ وہ پُرکشش شخصیت اور شکیل چہرے کے آدمی تھے۔ یونی ورسٹی کے زمانے میں تو ان کی خوش پوشی کے بڑے چرچے ہوا کرتے تھے، یوں کھڑے کھڑے انھوں نے یہ بھی سوچا کہ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے؟ سانسوں کا آنا اور چلا جانا بس، یہ ہی نا اور اتنے ہی کے لیے ہمالہ سے کنیا کماری تک آدمی دوڑتا، ہانپتا، مارتا، کاٹتا رہ جاتا ہے۔ انھوں نے خود سے کہا، زندگی کی کیا کہتے ہو، کیا پوچھتے ہو، نمازِ جنازہ کی اذان نہیں ہوتی، اذان تو بوقت پیدائش ہی ہو جاتی ہے اور اذان اور جماعت کا وقفہ؟ ہے اور کبھی نہیں ہے، تو بس اتنی ہی زندگی ہے۔ اچھے وقت کا کیا ہے، ابھی ہے ابھی نہیں ہے، منٹوں میں تاریخ بنا مٹا دیتا ہے، منٹوں میں غائب کر دیتا ہے۔ یہ کیسا منصف ہے، کیا گواہ، کیسا قاتل کہ صفحۂ ہستی کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتا ہے اور ایسے ہی ایک دن نفسی نفسی کے عالم میں ہم میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے اور آفتاب سوا نیزے پر ہوگا۔ اس وقت وہ خود اپنے آپ کو یاد آئے۔ وقت نے ان کے ساتھ بھی کیسی کیسی آنکھ مچولی کھیلی؟ کچھ ہی دنوں قبل عزیز احمد ایک شادی کی تقریب میں مدعو تھے، ایک پرانے آشنا مل گئے۔ دنیاداری میں طاق، ہاتھ ملاتے ہی انھوں نے پوچھا۔

''ان دنوں آپ کہاں ہیں؟'' عزیز احمد نے ان کے سوال کو اچھی طرح سمجھا لیکن جواب میں بولے۔ ''آپ کے سامنے ہوں۔'' ایسے جواب سے وہ دوست نما آشنا گڑبڑا گئے، ''نہیں میرا مطلب.....''

''ہاں وہ میں سمجھا، بھائی آپ مجھ سے ملیے نا، میری کرسی کی جستجو کیوں ہے آپ کو، کرسی کو آدمی بناتا ہے، کرسی آدمی کو نہیں بناتی ہے۔'' اس طرح کا جواب پا کر وہ حیران بھی ہوئے اور خفیف بھی اور دوسری طرف چلے گئے لیکن یہ احساس عزیز صاحب کو نیا زخم دے گیا کہ لوگ صرف عہدوں سے شیک ہینڈ کرتے ہیں۔ انھیں دنوں ان کا بہت پرانا جرنلسٹ دوست روی رنجن ملنے آیا تو باتوں باتوں میں انھوں نے اپنی کسک کا اظہار کیا۔ پھر روی رنجن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دل پر بوجھ کیوں لیتے ہو یار، سنسار تو دکھوں کا سمندر ہے، یہاں ہمیں بن باس کی سزا کاٹنی ہے اور لقمۂ اجل ہو جانا ہے کہ وناش اور موت ہی تو سنسار کی بنیاد ہیں، یہاں خوشی کی تلاش اندھیرے کمرے میں سیاہ بلّی کی تلاش ہے، یا پھر یہ کوشش گرم برف کی تلاش کہلائے گی..... آج اس وقت وہاں کھڑے کھڑے عزیز احمد کو ایک مدھم سی آواز سنائی دی..... سورج آخری منزلوں سے گزر چکا ہے، شام کی تاریکی تیزی سے بڑھ رہی ہے، پیچھے گھوم کر دیکھو، وہاں اب تمھارا سایہ بھی نہیں رہ گیا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے کچھ دنوں بعد ہی سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تو بیوی نے کہا۔ ''دراصل آپ کو ایک لمبے عرصے تک کام کرنے اور مصروفیت کی زندگی گزارنے کی عادت سی ہو گئی ہے اور اب جو آپ ایک دم سے فارغ ہو گئے ہیں تو اسی لیے ایسا

ہے، طبیعت کی کوئی خرابی نہیں ہے۔'' وہ خاموش اپنی بیوی کو دیکھتے رہے اور پینتالیس برسوں کی رفاقت انھیں یاد آتی رہی۔ چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے بیوی نے کہا۔ ''کوئی کام کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے، مصروف ہو جایئے گا تو خود بخود آپ کو آرام ملے گا۔'' وہ مُسکرا کر بولے۔ ''جہاں سے میں سبک دوش ہوا ہوں، اس کے بعد اور کوئی دوسری جگہ میرے لیے مناسب نہیں ہوگی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ کام تو کام ہے۔ آپ ڈائرکٹری کی لاش کب تک کاندھوں پر لیے پھریے گا۔''

وہ خاموش ہی رہے۔ کیسے سمجھاتے کہ اب جو کچھ بھی ملے گا، وہ کم تر ہی ہوگا۔

بیوی نے پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ مل جائے تو کر لیجیے۔ یہ جو تنگی رہتی ہے گھر میں، وہ تو دور ہو جائے گی، کچھ اور نہیں تو آپ کا اور میری دواؤں اور ڈاکٹر کا ہی خرچ نکل آئے گا۔'' اس وقت ان کا بیٹا بھی وہاں آ گیا، ماں کے ڈائلاگ کا آخری حصہ شاید اس نے سن لیا تھا، بیٹھتے ہی بولا۔ ''امّی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں، آپ کی طبیعت بھی بہل جائے گی اور.....'' آگے وہ کچھ بول نہ پایا کہ عزیز احمد اسے بڑی اداس لیکن گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماں نے بیٹے کی مشکل کو محسوس کیا اور ٹھنڈے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''یوں کتابیں پڑھنے اور اخباروں، رسالوں کے لیے لکھتے رہنے سے کیا ملا آپ کو اب تک، کچھ اور کرتے تو کہاں سے کہاں رہتے، کم از کم ان لوگوں ہی سے تعلقات رکھتے جو اونچی کرسیوں پر ہیں، دیکھیے اپنے دوستوں کو اور ساتھیوں کو کہ جیسے بھی بن پڑا ان لوگوں نے، جگہ بھی حاصل کی اور پیسے بھی کمائے اور آپ نے کیا کیا؟ جب آپ کے عروج کا زمانہ تھا، کبھی جو کوئی تحفہ ڈالی لے کر آیا، اسے بھی آپ نے رگید دیا، کمانے والے زبان میٹھی اور سر جھکا کر رکھتے ہیں لیکن آپ کے انداز تو ہمیشہ انوکھے ہی رہے۔'' عزیز احمد اُکتا کر اٹھ گئے، پیالی میں چائے آدھی باقی ہی رہ گئی۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے بیٹے کا آخری جملہ سنا۔ ''آپ بہت قابل، بڑے دانشور ہوا کیجیے، اصل بات یہ ہے کہ آپ کو مادّی فائدہ کیا ہوا؟''

''زیرو۔'' ماں نے جملے کو ختم کیا۔

گردن گھما کر عزیز احمد نے کہا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔''

''تو بتایئے ہمیں بھی کہ کون سا قارون کا خزانہ مل گیا آپ کو؟''

''ایک انمول شے۔''

''یعنی؟''

''دوستوں کی دشمنی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے، وہاں ٹی۔ وی۔ بہ دستور چل رہا تھا۔ انھیں وہاں دیکھ کر نواسے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ انھوں نے یہ دیکھا بھی اور محسوس بھی کیا اور آگے بڑھ گئے۔ اس واقعہ کے بعد عزیز احمد ایک بار پھر سخت بیمار ہوئے۔ ای۔ سی۔ جی۔ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''آپ کوئی نشہ آور چیز لیتے ہیں کیا؟''

''بالکل نہیں۔ صرف سگریٹ پیتا ہوں لیکن رات کو لکھنے یا پڑھنے کے درمیان۔''

''تو جناب نشہ اور کیا ہوتا ہے؟ آپ کے پاس سگریٹ ہے کیا؟''

انھوں نے خوش ہوکر اپنا نیا پیکٹ ڈاکٹر کی طرف بڑھادیا۔ ڈاکٹر نے پورا پیکٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ''آپ خوش قسمت ہیں۔''

''کیسے؟''

''وہ یوں کہ اب بھی آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ آپ اپنی وصیت تیار کرواسکیں.....'' عزیز احمد سناٹے میں آگئے۔ رات گئے حسبِ معمول جب وہ کچھ لکھنے پڑھنے بیٹھے تو انھیں ایک عجیب سے خلا کا احساس ہوا، جیسے کوئی بہت پرانا دوست بچھڑ گیا ہو، جیسے کچھ چھوٹ گیا ہو، جیسے کچھ کھو گیا ہو، کچھ لکھنے کے بعد وہ حسرت سے اپنی اُن انگلیوں کو دیکھتے رہے، جن کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ انھیں Inspire کیا کرتا تھا۔ انھیں اپنے سگریٹ کے Smoke rings بہت یاد آئے۔ انھیں لگا کسی ہمدمِ دیرینہ کا ہاتھ ان کی سانسوں سے ہٹ گیا ہو۔ انھوں نے خود کو بہت اکیلا محسوس کیا۔ اس وقت انھیں اپنا ایک اور پرانا ساتھی یاد آیا۔ ان کا ٹرانزسٹر۔ دل کی باتیں تو وہ ہی کہتا تھا جسے عزیز احمد کانوں سے نہیں دل کے نہاں خانوں میں سنا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا سارا کمرہ اُلٹ پلٹ دیا لیکن انھیں اپنا ٹرانزسٹر نہ ملا۔ بیوی نے آوازیں سنیں تو ان کے کمرے میں آگئیں، بولیں۔ ''نیند نہیں آتی تو گولیاں کیوں نہیں کھالیتے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے، دراصل میں اپنا ٹرانزسٹر کھوج رہا ہوں۔''

''اب یہ نیا خبط سوار ہوا، کوڑا کباڑا، سب اسٹور میں ہے، وہیں ہوگا شاید۔'' ان کی بیوی سونے چلی گئیں، عزیز احمد نے مزید تنہائی محسوس کی، ان کے اندر کا سناٹا مزید گہرا ہوگیا اور رات کی خاموشی میں دبے پانو وہ اسٹور میں داخل ہوگئے..... اندھیرے کمرے میں سیاہ بلّی کی تلاش۔ عجیب افراتفری تھی وہاں، سارے میں گندگی اور دیواروں کے چہار طرف جالے۔ کوک روچ، مچھر اور چیونٹیاں، ٹوٹے بکھرے ہوئے تلے اوپر سامان ہی سامان، ردّی کا انبار، لگا وہ کسی کوڑے دان میں داخل ہوگئے لیکن یہ سب انھیں روک نہ سکے۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے ہوئے وہ اپنا ٹرانزسٹر، اپنا ساتھی تلاش کرتے رہے۔ چند لمحوں کی

خوشی کا ادنا سا وسیلہ ویسے بے پناہ خرابے میں..... رات گزر گئی..... دن کی روشنی میں بیوی اور بیٹے اورنواسے انھیں ڈھونڈتے ہوئے اسٹور روم کے کھلے دروازے تک آئے اور اپنے رومالوں سے ناک بند کر کے حیران آنکھوں سے انھوں نے دیکھا، عزیز احمد کو ان کا ٹرانزسٹرمل گیا تھا، ان کے چہرے پر فاتحانہ چمک تھی اور ہونٹوں پر ابدی مسکراہٹ۔

صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے اور بھولے بسرے گیتوں کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔

لفظ و معنی

مستزاد	-	زیادہ کیا گیا
وجاہت	-	دبدبہ، حکومت، چہرے کا رعب
شکیل	-	خوب صورت
طاق	-	یکتا، لاثانی
خفیف	-	شرمندہ
جرنلسٹ	-	صحافی
عروج	-	بلندی، اونچائی
ہمدمِ دیرینہ	-	پرانا دوست
خبط	-	جنون، دیوانگی

آپ نے پڑھا

- کسی بڑے عہدے سے سبک دوش ہو جانے والا ایک شخص اپنی گذشتہ زندگی کی اصول پسندی، ایمان داری اور طرز بود و باش کے متعلق اپنوں کے دل آزار طنز و تمسخر کو سہتا ہوا اپنی بڑھتی ہوئی تنہائی کا مداوا، پھینک دی گئی ایک بے کار شے میں جس طرح خود کو پاتا ہے، اس کی ایک زندہ اور دل پر اثر کر جانے والی یہ کہانی ہے۔
- ایک باوقار ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد، لوگوں کے حافظے سے فراموش ہونے کے ساتھ ساتھ اپنوں (نواسہ، بیٹا اور بیوی) کے رویے اور سلوک کی سفاکی اور بے رحمی کو اس افسانے کا مرکزی کردار سیّد عزیز احمد شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ اس کا ردِ عمل ایک ایسے خود آگاہ اور ہوش مند شخص کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے جس نے انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کے مقابل زندگی کی سچائیوں کو دریافت کر لیا ہے اور جو ان رشتوں سے الجھنے کے بجائے اپنے معمولات زندگی سے ہی 'چند لمحوں کی خوشی' کے حصول کی خاطر تنہائی کے رفیق سہاروں کی تلاش سے باز نہیں آنا چاہتا ہے۔ یہ سہارے مضرّت رساں سگریٹ جیسی شے اور یک طرفہ طور پر تنہائی کا مداوا بن جانے والا ٹرانزسٹر جیسی بے کار شے ہی کیوں نہ ہوں۔
- افسانے کے مرکزی کردار کے فکر و احساس کی دنیا نشیب و فراز کے جس شدید طوفان سے گزرتی ہے اس کی فن کارانہ عکاسی

افسانہ نگار کی بصیرت اور اظہار و بیان پر اس کی قدرت کا پتہ دیتی ہے۔

آپ بتایئے

1. سید عزیز احمد کس عہدے سے سبک دوش ہوئے؟
2. ان کا نواسہ ٹیلی وژن پر کیا دیکھ رہا تھا؟
3. روی رنجن کون تھے؟
4. کیا ڈاکٹر کی بات سن کر وہ سناٹے میں آ گئے؟
5. ان کا اپنا ایک اور پرانا ساتھی کیا تھا؟
6. ٹرانزسٹر مل جانے کے بعد کیا ان کے چہرے پر فاتحانہ چمک تھی؟
7. بھولے بسرے گیتوں کا پروگرام کتنے بجے ختم ہو گیا؟

مختصر گفتگو

1. ڈائرکٹر جنرل سید عزیز احمد لوگوں کے ذہنوں سے کیسے فراموش ہو گئے؟
2. 'آپ ڈائرکٹری کی لاش کب تک کاندھوں پر لیے پھریے گا؟' یہ بات بیوی نے سید عزیز احمد سے کیوں کہی؟
3. آپ بہت قابل، بڑے دانشور ہوا کیجیے، اصل بات یہ ہے کہ آپ کو مادی فائدہ کیا ہوا؟' بیٹے نے یہ بات کیوں کہی؟
4. وہ ٹرانزسٹر کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟

تفصیلی گفتگو

1. افسانہ بھولے بسرے گیت کی تلخیص پیش کیجیے۔
2. سید عزیز احمد کے کردار پر اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔
3. اس افسانے کی روشنی میں شفیع جاوید کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. شفیع جاوید کے دوسرے مشہور افسانوں کا مطالعہ کیجیے۔
2. بہار کے مشہور افسانہ نگاروں کی فہرست بنایئے۔

سلام بن رزّاق

سلام بن رزّاق مہاراشٹر کے پن ویل میں 15 نومبر 1941 کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم ڈپلوما ان ایجوکیشن کی ہے اور بمبئی میونسپل کارپوریشن کے اسکولوں سے 35 برس تک استاد کی حیثیت سے منسلک ہونے کے بعد 1999 میں وہ سبک دوش ہوئے۔ سلام بن رزّاق فی الوقت بمبئی میں مقیم ہیں۔

1964 میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ 'ننگی دوپہر کا سپاہی' (1977)، 'معبر' (1987) اور 'شکستہ بتوں کے درمیان' (2001) ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ماہم کی کھاڑی'، 'شری پاد کرشن کول ہٹکر' کی کتابیں انھوں نے مراٹھی سے ترجمہ کی ہیں۔ ہندی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'کام دھینو' 1988 میں شائع ہوا۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کی مرتبہ اور مترجمہ کتاب 'عصری ہندی کہانیاں' 1995 میں شائع کی۔ 1998 میں انھیں ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ دیا گیا۔ مہاراشٹر، اتر پردیش اور بہار اردو اکادمیوں نے انھیں متعدد بار انعامات سے نوازا۔ 2004 میں 'شکستہ بتوں کے درمیان' کتاب کے لیے انھیں ساہتیہ اکادمی انعام سے سرفراز کیا گیا۔

جدیدیت کے بعد ہم عصر افسانے کی جو نئی نسل ہمارے سامنے آئی۔ اس میں سلام بن رزّاق سب سے معتبر لکھنے والے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے علامتی طرزِ اظہار میں صراحت کا طور شامل کر کے یہ راستہ دکھایا کہ ہمارے روایتی افسانے کا جادو ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور نئے افسانوں میں اس کے لہو کو شامل کر لیا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ نفسیاتی سطح پر اپنے کرداروں کے داخل میں اترنے کی بے پناہ صلاحیت سلام بن رزّاق میں موجود ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر کردار ہمارے آس پاس کی زندگی میں موجود ہیں۔ کمزور اور مشکل حالات میں پھنسے انسانوں کے تئیں ان کا جھکاو ان کی عوام دوست فکر کا غماز ہے۔

سلام بن رزّاق کے یہاں ایسے کرداروں پر اچھی خاصی توجہ ہے جن کے ساتھ قدرت یا حالات نے انصاف نہیں کیا۔ ان کی زندگی کا ہر سرا الجھ گیا ہے۔ وقت کے جبر سے وہ عجیب الخلقت ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے تئیں واضح انسانی برتاو کی سلام بن رزّاق بھرپور وکالت کرتے ہیں۔ فسادات اور نئے سماجی اور مذہبی تناظر کا بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں باضابطہ مطالعہ کیا ہے۔

سلام بن رزّاق

مختصر افسانہ

ابراھیم سقّہ

''عبدالرّب! آپ کے اسکول کی تعلیمی حالت اطمینان بخش ہے۔ میں نے اپنے ریمارکس میں تفصیل سے اس کا ذکر کر دیا ہے۔''

''شکریہ سر!'' عبدالرّب کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اب میں کچھ دیر باہر کھیتوں میں ٹہلنا چاہتا ہوں۔'' میں نے عینک لگاتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ چاہیں تو کسی کو آپ کے ساتھ.....''

''نہیں.....اس کی ضرورت نہیں۔''

''سر، رات کے کھانے کا انتظام غریب خانے پر کیا ہے۔ آئیں گے نا.....''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے اسکول کی عمارت سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں ایک گہری سانس لی۔ سامنے کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ فصل کٹ چکی تھی۔ البتہ کٹے ہوئے پودوں کے ٹھٹھ کھیتوں سے جھانک رہے تھے۔ دائیں طرف مسجد کا ہرا گنبد اور اس کا اونچا مینار نظر آ رہا تھا۔ پاس ہی تالاب میں دو چار بچے نہا رہے تھے اور تالاب کی دوسری سمت پٹیل رائس مل کی چمنی سے دھواں نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ رائس مل کی دھک دھک کی ہلکی ہلکی آواز یہاں سے بھی سنائی دے رہی تھی جیسے سناٹے کا دل دھڑک رہا ہو۔ دھوپ اپنے پر سمیٹ رہی تھی اور شام کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، اسکول کی عمارت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ پچیس برس پہلے کا دھورن گانو میری یادداشت میں زندہ ہو رہا تھا۔ عرصہ ہوا میں اس گانو اور دیہات کی ہر ایک بات کو ایک ناخوش گوار خواب کی طرح بھلا چکا تھا مگر کسے پتا تھا کہ پچیس برس بعد مجھے ایک بار پھر یہاں ایک انسپکٹر کی حیثیت سے اُسی اسکول کا معائنہ کرنے آنا پڑے گا جہاں ایک مدرّس کی حیثیت سے میرا تقرّر ہوا تھا۔ ان دنوں دھورن گانو میں نہ بجلی تھی، نہ نل آیا تھا۔ لوگ کنوؤں کا پانی پیتے اور اکثر نارو جیسے موذی مرض میں مبتلا رہتے۔ جب مجھے تقرّری کا آرڈر ملا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مدرّس بننا میرا ایسا خواب تھا جو میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ مگر احباب و رشتہ داروں نے نارو کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میرے تصور میں نارو کا کیڑا کسی خوفناک اندیشے کی طرح کلبلانے لگا۔ لمبا اور لجلجا کیڑا جو کسی کیچوے کے مانند ٹخنے کے اوپر ایک چھوٹے سے زخم سے نکل کر پہلے پانو پھر پورے بدن کے گرد دھاگے کی طرح لپٹ جاتا تھا۔ مگر یہ خوف عارضی تھا۔ ملازمت ملنے کی خوشی رفتہ رفتہ میرے ہر خوف پر غالب آ گئی تھی۔

آرڈر کے مطابق میں تیسرے روز دھورن گانو کے اسکول میں حاضر ہو گیا تھا۔ اسکول میں میرے علاوہ دو اساتذہ اور تھے۔ جناب بدرالدین اسکول انچارج اور دوسرے امیر علی جو میری طرح معاون مدرّس تھے۔ امیر علی کی سروس پندرہ برس پرانی تھی۔ ان کا پچھلے

سال ہی یہاں تبادلہ ہوا تھا۔ انھوں نے اسکول کے پاس ہی ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ امیر علی نے مجھے بھی اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لی۔ اس طرح رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا۔

اسکول میں حاضر ہونے کے دوسرے دن میں اور امیر علی صبح کی چائے پی رہے تھے کہ دُبلا پتلا مگر مضبوط ہاتھ پانو والا بیس پچیس برس کا ایک نوجوان پانی کی مشک لیے کمرے میں داخل ہوا۔

''سلام علیکم ماسٹر صاحب۔''

اُس نے ہمیں سلام کیا اور اپنی مشک سے ہمارا مٹکا اور بالٹی بھر دیا۔ پھر اپنی ڈھیلی ڈھالی پھٹی آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا میری طرف دیکھ کر امیر علی سے مخاطب ہوا۔

''لگتا ہے نئے ماسٹر ساب ہیں۔''

''ہاں۔'' امیر علی نے چائے کی سپ لی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ''شیخ صاحب! یہ ابراہیم سقّہ ہے۔ اسے لوگ ابو کے نام سے پکارتے ہیں۔ سمجھے ''ابو'' گانو کا اکلوتا ساقی ہے۔ سب اسی کے ہاتھ کا پانی پیتے ہیں۔''

''اچھا۔ اچھا۔'' میں نے ابراہیم سقّہ عرف ''ابو'' کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ ابراہیم اپنی تعریف سے خوش ہو گیا تھا۔ اس نے ایک محجوب مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور مجھے سلام کرتا ہوا خالی مشکیزہ لیے ہوئے باہر چلا گیا۔ اس کے پیروں میں چپل نہیں تھی۔ اور وہ زمین پر پانو جما جما کر چلتا تھا۔ چلنے میں وہ ذرا آگے کو جھک جاتا تھا۔ شاید مشکیزہ اٹھا اٹھا کر اسے اس طرح چلنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کے بدن پر ایک بوسیدہ کوٹ تھا جس کے پھوسڑے نکل آئے تھے۔ اس نے ہاف پینٹ پہن رکھی تھی جس کے ایک پائنچے میں بڑا سا پیوند لگا ہوا تھا جو دور سے بھی نظر آ جاتا تھا۔ ابراہیم عرف ابو کی شخصیت میں ایسی کوئی جاذبیت یا غیر معمولی بات نہیں تھی کہ اسے یاد رکھا جاتا مگر آگے چل کر دھیرے دھیرے ابراہیم سقّہ کی شخصیت مجھ پر کسی پُراسرار منظر کی طرح منکشف ہوتی چلی گئی۔ ایک دن میں کمرے میں لیٹا شوق لکھنوی کی ''زہرِ عشق'' پڑھ رہا تھا۔

کر دیے جس نے گھر کے گھر خالی　　کر دیے جس نے گھر کے گھر خالی

بڑا لطف آ رہا تھا۔ ''سلام علیکم'' کی آواز کان میں پڑی۔ چونک کر دیکھا۔ ابراہیم سقّہ مشکیزہ لیے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دوبارہ کتاب میں منہمک ہو گیا۔ ابراہیم نے کمرے میں رکھے تینوں خالی برتن بھر دیے۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ''ماسٹر ساب! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں، ہاں، پوچھو کیا بات ہے؟'' میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ''زہرِ عشق'' میں اس قدر مزہ آ رہا تھا کہ اُس وقت اُس کا یوں کھنڈت ڈالنا اچھا نہیں لگا۔

''ماسٹر ساب! سنا ہے آپ شاعری کرتے ہیں۔''

مجھے شعر و شاعری سے رغبت تھی اور فرصت کے اوقات میں شغل کے طور پر تک بندی بھی کر لیتا تھا۔ چار چھے غزلیں چھوٹے

موٹے اخباروں میں چھپی تھیں۔ دو چار مشاعرے بھی سر کر لیے تھے۔ مگر اس سے کو میری شاعری سے کیا لینا دینا۔

''تم سے کس نے کہا۔'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''عبداللہ بھینسا بول رہا تھا۔''

''کون عبداللہ بھینسا؟'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''سرپنچ کا لڑکا..... عبداللہ بھینسا۔''

مجھے اندر سے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اب لوگ باگ ادھر ادھر میری شاعری کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ یہ ذکر کرنے والے، عبداللہ بھینسا جیسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر میں نے اپنی دلی مسرت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اُسے اندر ہی اندر اس طرح چھپا لیا جیسے کنجوس اپنی دولت چھپاتا ہے۔ اُسی طرح اپنے لہجے کو خشک رکھتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں تم کس عبداللہ بھینسا کی بات کر رہے ہو؟''

''پر آپ شاعری کرتے ہیں نا؟''

ابراہیم کے لہجے میں ایک تجسس کے ساتھ دبا دبا جوش تھا جیسے یہ جان لینے کے بعد کہ میں شعر کہتا ہوں، وہ کوئی بہت بڑی شرط جیتنے والا ہو۔ پانی بھرنے والے ایک بھشتی کا شاعری کے بارے میں اس قدر اشتیاق ظاہر کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ مگر چونکہ استفسار میری شاعری سے متعلق تھا، اس لیے میرا لہجہ قدرے ملائم پڑ گیا۔ میں نے کہا۔

''ہاں کرتا ہوں۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بات یہ ہے ماسٹر ساب کہ میں بھی تھوڑی بہت شاعری کرتا ہوں۔''

''کیا.....؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم شاعری کرتے ہو؟''

''جی ہاں..... مگر گانو میں سب میرا مجاک اُڑاتے ہیں۔ اجاجت دو تو کل آ کر آپ کو سناؤں۔''

پہلے تو جی میں آیا سختی سے منع کر دوں مگر اُس کے لہجے کی لجاجت اور اشتیاق دیکھ کر ایک دم سے منع کرنا اچھا نہیں لگا۔ میں نے پوچھا۔

''تم کہاں تک پڑھے ہو؟''

''میں چوتھی میں تھا کہ میرے باپ کو نارو ہو گیا۔ اُس کا سیدھا پانو بے کار ہو گیا۔ باپ کا کام مجھ کو سنبھالنا پڑا۔''

''گویا پانی بھرنے کا کام تمھارا آبائی پیشہ ہے۔'' میرے لہجے میں چھپی حقارت کو وہ سمجھ نہیں پایا۔

''آبائی یعنی کیا.....؟''

''یعنی پانی بھرنے کا کام تمھارا خاندانی پیشہ ہے۔''

''یہی سمجھیے، میرا باپ تو یہی کام کرتا تھا۔ دادا کیا کرتا تھا معلوم نہیں۔''

''تمھارے بال بچے؟'' اُس کی ذات میں میری دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

''ابھی تک شادی نہیں ہوئی تو بال بچہ کہاں سے ہوگا ماسٹر ساب!''

اُس نے قدرے شرماتے ہوئے شوخی سے کہا۔ میں بھی ہنس دیا۔

''تو پھر کب آؤں؟'' اُس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''کل مغرب بعد آ جانا۔'' میں نے یوں ہی ٹالنے کے لیے کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اپنا مشکیزہ بغل میں دبائے حسب عادت جما جما کر قدم رکھتا ہوا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کے بدن پر وہی کل والا سیاہ کوٹ اور پیوند زدہ ہاف پینٹ تھی۔

شام کو میں نے امیر علی سے ابراہیم سقہ کا ذکر کیا کہ کل مغرب بعد وہ مجھے اپنی شاعری سنانے آ رہا ہے۔ امیر علی ہنس دیے۔ امیر علی کو شعر و شاعری سے کوئی شغف نہیں تھا۔ وہ ایک بسیار خور اور بسیار خواب انسان تھے۔ وہ مدرّسی کے پیشے میں بھی صرف اس لیے آئے تھے کہ اس میں محنت کم اور آرام زیادہ تھا۔ البتہ وہ ٹیوشن خوب کرتے تھے۔ دھورن گانو کے لوگ کافی خوش حال تھے۔ تجارت اور زراعت ان کے اہم پیشے تھے۔ خوب محنت کرتے، خوب کھاتے اور خوب بچے پیدا کرتے۔ ابھی یہاں تعلیم کا چلن عام نہیں تھا۔ تاہم وہ پرائمری اسکول کی حد تک بچوں کو ضرور تعلیم دلواتے۔ چوتھی تک اسکول تھا، اکثر بچے چوتھی جماعت کامیاب ہونے کے بعد یا تو کاروبار میں لگ جاتے یا کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیتے۔ اسکولی تعلیم کے دوران بچوں کو ٹیوشن دلوانا یہاں کا عام رواج تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جب امیر علی نے بتایا کہ وہ اپنی اسکول کی تنخواہ سے دوگنا رقم ٹیوشنوں سے کماتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ٹیوشن کے لیے بچے ٹیچر کے پاس بہت کم آتے ہیں۔ ٹیچر کو ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔ یہاں ٹیچر کو ٹیوشن کے لیے اپنی ڈیوڑھی پر بلانا ہم چشموں میں وقار کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ویسے یہ لوگ ٹیچر کا کافی خیال رکھتے تھے۔ گانو کے کھاتے پیتے گھروں کی جانب سے ٹیچروں کے لیے روزانہ باریاں مقرر تھیں۔ جس گھر میں کھانے کی باری ہوئی، وہاں ایک روز پہلے کسی بچے کے ذریعے یاد دہانی کرا دی جاتی۔ دوسرے دن دونوں وقت کمرے پر کھانے کا ٹفن پہنچا دیا جاتا تھا۔ امیر علی تو خیر اس تغارے کے عادی ہو گئے تھے مگر مجھے شروع میں بڑا تکلف ہوا۔ بلکہ شرم بھی محسوس ہوئی مگر امیر علی نے دلیل دی کہ ''اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ یہ ہمارے ملک کی قدیم روایت ہے۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ پرانے زمانے کے گرو اپنے شاگردوں سے پڑھانے کی فیس نہیں لیتے تھے بلکہ ان کے شاگردان کے لیے ''بھکشا'' مانگ کر لاتے اور اسی پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہمیں تو پڑھانے کی تنخواہ ملتی ہے اور ہم ٹیوشن فیس بھی لیتے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تعلیم کا کوئی مول نہیں ہوتا۔''

میں چپ ہو گیا۔ امیر علی ایک عادی مفت خور تھے۔ انھیں قائل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ابراہیم سقہ کے ذکر پر انھوں نے ہنس کر صرف اتنا کہا۔

''شیخ صاحب! یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ شاعری وائری تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ دو چار معقول ٹیوشن کیجیے اور پیسے

کمایئے۔ابراہیم سقّہ تو بستی میں ویسے بھی نیم پاگل ہو رہے، آپ اس کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔"

امیر علی اتنا کہہ کر ٹیوشن کو چل دیے۔ مجھے ان کا اس قدر کھرا کھرا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ مگر میں نے پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔

دوسرے دن میں مغرب بعد لیسن نوٹ تیار کر رہا تھا کہ ابراہیم سقّہ "سلام علیکم" کا نعرہ بلند کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کیروسین لیمپ کی دھندلی روشنی میں دیکھا۔ وہ دن کے مقابلے میں کافی معقول اور نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اُس نے سفید لٹھے کا کرتا اور پائجامہ پہن رکھا تھا۔ پیر میں معمولی سی چپل بھی تھی۔ بال میں تیل لگا کر انھیں پیچھے کی طرف سلیقے سے جما دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلی بیاض تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"یہ میری سائری کی بیاج ہے، سٹر ساب! آپ دیکھنا، اس میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔"

میں نے بیاض کھول کر دیکھا۔ چیونٹیوں کی طرح رینگتے حروف میں شاعری کے نام پر کچھ اُلٹے سیدھے مصرعے لکھے ہوئے تھے۔ مگر اس کے لکھے خط کو پڑھنا آسان نہیں تھا۔ میں نے بیاض اسی کی طرف آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم تم خود اسے پڑھ کر سناؤ۔"

"اچھا ماسٹر ساب!" اُس نے بیاض واپس لیتے ہوئے سعادت مندی سے گردن ہلائی اور مخصوص غلط تلفظ کے ساتھ اپنی شاعری سنانے لگا۔ شاعری کیا تھی، بس کچے پکے خیالات کو اس سے زیادہ کچے پکے لفظوں میں ڈھالنے کی بچکانہ سی کوشش تھی۔

آتا ہے یاد مجھ کو تیرا کھڑکی میں آنا اور میرے نازک دل پر بجلی گرانا

کچھ ایسے ہی مہمل اور بے وزن اشعار سے پوری بیاض بھری ہوئی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا، تمھارے پاس خیالات تو ہیں مگر ان خیالات کو ڈھالنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ ظاہر ہے جب تک تم ڈھیر ساری کتابیں نہیں پڑھو گے، الفاظ نہیں مل سکتے۔ اس لیے شعر کہنے سے پہلے تمھیں بہت ساری کتابیں پڑھنی ہوں گی۔"

"کتابیں تو میں پڑھتا ہوں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کون سی کتابیں؟"

"قصہ نورنامہ، سخاوت نامہ، قصہ دائی حلیمہ، قصہ یوسف زلیخا، قصہ طوطا مینا....."

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں ابراہیم، ان کتابوں سے شاعری نہیں آتی۔"

"تو پھر آپ مجھے شاعری سیکھنے کی کوئی کتاب کا نام بتایئے نا..... میں خریدوں گا۔"

اب میں اسے کس کتاب کا نام بتاتا جس میں شاعری سیکھنے کے نسخے درج ہوں۔ میرے پاس دیوان داغ کا ایک سستا پرانا ایڈیشن رکھا تھا۔ وہ میں نے اسے دے دیا اور کہا۔

"دیکھو۔ پُرانے شاعروں کے ایسے ہی دیوان پڑھو۔ پڑھتے رہو، تمھیں شاعری آجائے گی۔"

"واقعی!" اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ چہرہ روشن ہو گیا۔ میں نے لیمپ کی مدھم روشنی میں اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔

اُس کا رنگ بچپن میں یقیناً گورا رہا ہوگا۔ مگر دھوپ برسات میں پانی بھرتے بھرتے اور موسموں کے مدّ و جزر سہتے سہتے اب اس کا رنگ تانبے کے مانند جل گیا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور پیشانی تنگ تھی۔ گالوں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی تھیں۔ ہونٹ پتلے اور کھلے ہوئے تھے جس سے اس کے سامنے کے دانتوں کی لکیر دکھائی دیتی تھی۔ گردن غیر معمولی لمبی تھی۔ کُل ملا کر وہ بہت معمولی شکل وصورت کا انسان تھا۔ ''دیوانِ داغ'' کا نسخہ ہاتھوں میں لے کر اس نے اسے ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھا، رُک رُک کر وہ ایک شعر بھی پڑھنے کی کوشش کی۔

''لاکھ دینے کا..... ایک..... دینا ہے، دل..... بے.....''

یہ کیا ہے ماسٹر ساب! اس نے ایک شعر پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دل بے مُدّعا دیا تو نے

''بے مُدّا، یعنی کیا؟''

''بے مُدّا نہیں، بے مدعا..... یعنی جس کا کوئی مدعا، کوئی خواہش نہ ہو۔''

''اچھا..... اچھا۔'' پھر اس نے مقطع پڑھنا شروع کیا۔

داغ کو کون..... دینے..... والا تھا جو دیا..... اے..... خدا دیا

''کیوں ماسٹر ساب ٹھیک پڑھا، میں نے.....؟''

''ٹھیک ہے، پڑھتے پڑھتے پڑھنا آجائے گا۔''

اس نے دیوانِ داغ اور اپنی بیاض کو کسی دستاویز کی طرح اپنی پرانی تھیلی میں لپیٹ کر رکھ لیا اور مجھے سلام کر کے رُخصت ہو گیا کیوں کہ ایک لڑکا میرے لیے باری کا کھانا لے کر آ گیا تھا۔ میں نے یوں ہی اس سے رسماً پوچھا۔

''تم نے کھانا کھایا ابراہیم!''

''نہیں ماسٹر ساب۔ اب جا کر روٹی بناؤں گا۔ بومبل کی چٹنی دوفیر (دوپہر) میں بنایا تھا، اسی سے کھالوں گا۔ آپ کھانا کھاؤ۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ دوسرے دن صبح ہمارے لیے مشکیزے سے پانی لے آیا اور مجھے اطلاع دی کہ اس نے رات میں دیوانِ داغ کی بارہ غزلیں پڑھ لیں ہیں۔ جن میں سے پانچ اشعار اسے زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ میں نے ''ہوں ہاں'' کر کے اسے ٹال دیا۔ اس کے بعد مجھے بھی صبح کے کچھ ٹیوشن مل گئے اور میں مصروف ہو گیا۔ گانو کی گلیوں میں ٹیوشن یا اسکول آتے جاتے وہ کبھی کبھار پانی کا مشکیزہ لیے گھروں کی ڈیوڑھیاں چڑھتا اترتا نظر آجاتا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتی تو دور ہی سے سلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا۔ بہر حال اس روز کے بعد اس نے اپنی شاعری کا ذکر بھی نہیں کیا۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ امیر علی طویل رخصت پر اپنے گانو گئے ہوئے تھے۔ میں دوپہر میں باری کا کھانا کھا کر

بیٹھا ہی تھا کہ ابراہیم آ گیا۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے اور چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس نے بتایا۔

''ماسٹر ساب! آپ کو آج شام میں بیدار خان دیش مکھ کے یہاں کھانے کی دعوت ہے۔''

دھورن گانو میں ایک چلن تھا۔ جب بھی کسی کے گھر میں اپنے بچے کو ٹیوشن رکھوانا ہوتا، وہ ماسٹر صاحب کو کھانے پر مدعو کرتا۔ اور کھانا کھانے کے دوران ہی ٹیوشن کی بات بھی طے ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ رواج اچھا لگا تھا۔ بیدار خان دیش مکھ گانو کی مسجد کا متولی تھا۔ گانو میں اس کی کپڑوں کی دکان تھی۔ اکثر آتے جاتے اس دوکان کے کاؤنٹر پر ایک ترش رو شخص کو دیکھا تھا، جس کی بھویں کمان کی طرح کھنچی ہوئی اور آنکھیں شرابیوں کی طرح چڑھی ہوئی رہتی تھیں۔ اس کا نچلا ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہی بیدار خان دیش مکھ متولی ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر میری طبیعت کافی بدمزہ ہو گئی تھی۔ اسی بیدار خان دیش مکھ نے کھانے پر بلایا تھا گویا ٹیوشن پر بلایا تھا۔ جی میں آیا یک بارگی انکار کر دوں مگر ساتھ ہی مجھے اس کے بارے میں یہ بھی معلوم تھا کہ بے حد کینہ پرور شخص ہے۔ اگر کسی سے خفا ہو جائے اور اس کے پیچھے پڑ جائے تو پھر قبر ہی میں اسے پناہ مل سکتی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ دھورن گانو میں رہ کر بیدار خان دیش مکھ کو ناراض کرنا سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لیے میں نے مصلحتاً بیدار خان دیش مکھ کی دعوت قبول کر لی۔

ابراہیم عموماً اکثر گانو کے لوگوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیا کرتا تھا۔ کیوں کہ بھشتی ہونے کے ناطے ابراہیم کا گانو کے اکثر لوگوں سے رابطہ تھا۔ مجھے بیدار خان دیش مکھ کا پیغام دے کر جب ابراہیم جانے لگا تو اچانک مجھے یاد آیا آج باری میں جو کھانا آیا تھا، اس میں سے خاصا کھانا بچ گیا ہے۔ میں نے سوچا شام کو پھر تازہ باری آ جائے گی۔ خواہ مخواہ بچا ہوا کھانا خراب کرنے کے بجائے ابراہیم کو کیوں نہ دے دیا جائے۔ میں نے کہا۔

''ابراہیم دیکھو اس برتن میں تھوڑا سا کھانا بچا ہے۔ تم کھا لو یا ساتھ لے جانا چاہو تو لے جاؤ مگر برتن شام تک واپس لے آنا۔''

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جاتے جاتے رُک گیا اور گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

''ابراہیم کیا سوچنے لگے بھائی۔ وہ کھانا لے جاؤ نا۔''

اُس نے گردن اٹھائے بغیر نظر اپنے پیر کے انگوٹھوں پر جما کر کہا۔

''ماسٹر ساب! آپ برا مت ماننا۔ ایک بات بولوں۔''

''ہاں، ہاں، بولو۔ کیا بات ہے؟'' مجھے اس کے رویّے پر تعجب ہو رہا تھا۔

''ماسٹر ساب، میں ایسا بچا کھچا کھانا نہیں کھاتا۔''

''کیا.....؟'' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں ماسٹر ساب! مجھ کو معاف کرنا۔ میں ایسا کھانا نہیں کھاتا۔ اگر میں گانو سے ایسا کھانا جمع کروں تو روز چھے آدمی کا کھانا جمع ہو جائے۔ مگر میں ایسا کھانا نہیں لیتا۔ میرے باپ نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ ''ابراہیم! جب تک ہاتھ پانو میں طاقت ہے، محنت سے روٹی کھانا۔''

''اوہو، اچھا اچھا۔'' مجھے فوری طور پر اس کی بات کا جواب دینے کے لیے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ میں ایک دم سے چپ ہوگیا۔ ابراہیم سقہ اسی طرح گردن جھکائے چلا گیا مگر جاتے جاتے میرے وجود کو متزلزل کر گیا۔ اس جاہل، کم سواد، کم عقل اور کم حیثیت شخص نے ایک جھٹکے سے میری کھال کھینچ کر مجھے یک لخت ننگا کر دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پورے وجود کے گرد ڈائنامائٹ کے تار لپٹے ہوئے تھے۔ ابراہیم سقہ نے اچانک ماچس کی تیلی جلائی اور مجھے خبردار کیا کہ دیکھو تم بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہو۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا۔ اس نے ماچس کی تیلی کو پھونک مار کر بجھا دیا اور میرے خوف پر طنز سے ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس نے فلیتہ نہیں لگایا مگر یہ جتا گیا کہ میں کسی بھی لمحہ بھک سے اُڑ سکتا ہوں۔ میں پورا دن مضطرب رہا۔ آخر میں نے شام ہوتے ہوتے فیصلہ کر لیا کہ میں بیدار خان دیش مکھ کے گھر دعوت میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے گھر پر آنے والی ''باری'' کا کھانا بھی بند کرا دیا اور کمرے پر خود اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھانے لگا۔ میں نے ٹیوشنوں کے لیے بھی کوئی تگ و دو نہیں کی۔ چار پانچ بچے شام میں کمرے پر ہی ٹیوشن کے لیے آجاتے تھے۔ میں نے انھیں پر اکتفا کر لیا۔

جب امیر علی چھٹیوں سے لوٹے تو انھوں نے میری اس عاقبت نااندیشی پر بڑا واویلا مچایا۔ میں نے انھیں بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ کمرہ ہی چھوڑ کر چلے گئے اور دوسری جگہ کرائے پر کمرہ لے کر رہنے لگے۔

ایک دن ابراہیم نے مجھ سے ڈرتے جھجکتے پوچھا۔

''ماسٹر ساب! آپ نے گانو کی باری کیوں بند کر دی؟ میں نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی کا دیا ہوا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

''دیے ہوئے کھانے میں اور باری کے کھانے میں فرق ہے نا ماسٹر ساب!''

''کوئی فرق نہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ بچا ہوا کھانا گھر پر جا کر لیا جاتا ہے اور باری کا کھانا گھر پر پہنچا دیا جاتا ہے۔''

اُس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ یا شاید جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور گردن جھکا کر واپس چلا گیا اور دو دن بعد میں ٹیوشنوں سے فارغ ہو کر شام کے لیے کھچڑی بگھار رہا تھا کہ ابراہیم کمرے میں داخل ہوا۔ مٹی کے تیل کی دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہے۔ میں سمجھا اس پر دوبارہ شاعری کا بھوت سوار ہوا ہے اور وہ پھر اصلاح کے لیے آیا ہے۔

''ماسٹر ساب آپ کے لیے چاول کی روٹی اور بومبل کی چٹنی لایا ہوں۔ کھائیں گے نا؟ میں نے خود بنائی ہے۔''

''ارے مگر میں نے تو کھچڑی چولھے پر چڑھا دی ہے۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔''

''کیا کروں ماسٹر ساب، میری کھولی بہت چھوٹی ہے۔ نہیں تو میں کھانا کھانے آپ کو اپنے گھر بلاتا۔'' اس کے لہجے میں شوق کے ساتھ دبی دبی حسرت بھی تھی۔

''کسی دن میں تمھارے گھر آ کر کھانا کھاؤں گا۔ بیٹھو، لاؤ تمھاری روٹی دو۔''

اس دن میں نے اسے زبردستی کھانے پر روک لیا۔ پہلے تو اس نے منع کیا مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں اس کی روٹی اور بومبل کی چٹنی کی تعریف کرتا رہا اور وہ میری کھچڑی کی۔ اچانک اس نے پوچھا۔

''ماسٹر ساب! آپ کی شادی ہوگئی؟''

''نہیں، ہونے والی ہے۔ منگنی ہوگئی ہے۔''

''اچھا، اچھا۔''

''اور تمھاری؟''

''ارے میں ٹھہرا اک معمولی پانی بھرنے والا گنوار بھشتی۔ میرے کو کون لڑکی دے گا۔''

''تمھارا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے؟''

''نہیں..... ویسے بھی تو گریب آدمی کا بس اللہ بیلی ہوتا ہے۔''

''اگر تمھاری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتاؤ۔ میں چل کر تمھاری طرف سے بات کروں گا۔''

''نہیں..... کوئی نہیں ہے۔''

میں نے دیکھا کہ اچانک وہ کچھ بے چین سا ہوگیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''کیا بات ہے ابراہیم؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں.....''

''تم کچھ چھپا رہے ہو۔''

وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''ارے بھائی شرماتے کیوں ہو۔ بتاؤ نا کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں ماسٹر ساب، میں چلتا ہوں۔''

وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور گردن جھکائے جھکائے ہی باہر نکل گیا۔

مجھے اس کے رویے پر حیرانی تھی۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے اچانک مضطرب کر دیا تھا۔ ذکر شادی اور لڑکی کا چل رہا تھا۔ شاید بے چارے کو اپنی کم مائیگی، محرومی اور اکیلے پن کا احساس ہوگیا تھا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ اس سے لڑکی کا ذکر چھیڑا۔ مگر شادی کا تذکرہ تو خود اسی نے کیا تھا۔

دوسرے دن وہ پانی کا مشکیزہ لے کر آیا۔ مجھے سلام کر کے مٹکے اور بالٹی میں پانی ڈال کر جانے لگا تو میں نے اسے ٹوک دیا۔

''ابراہیم کیا بات ہے، تم رات میں اچانک اٹھ کر چلے گئے۔ میری کوئی بات تمھیں بُری تو نہیں لگی؟''

''نہیں ماسٹر ساب! ایسی بات نہیں۔'' اس نے آستین سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی بات کا میں کبھی برا نہیں مان سکتا۔ چلتا ہوں۔''

وہ باہر نکل گیا۔ مگر میں نے اس کے لہجے میں چھپے کسی انجان دکھ کی لرزش کو محسوس کر لیا۔ تین چار روز گزر گئے۔ ابراہیم اپنے وقت

پر آتا، مٹکا اور بالٹی بھرتا اور چپ چاپ چلا جاتا۔ اس کے رویے میں عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ میں نے بھی اسے مزید کریدنا اچھا نہیں سمجھا۔

ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دور سے کسی قسم کے شور کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کچھ لوگ بیک وقت زور زور سے باتیں کر رہے ہوں۔ بیچ میں کسی کی چیخ بھی سنائی دی۔ پھر دھیرے دھیرے وہ آوازیں دب گئیں اور میں بھی جلد ہی سو گیا۔

دوسرے دن صبح جب میں اسکول گیا تو امیر علی نے بتایا کہ رات میں بیدار خان دیش مکھ کے گھر میں چور گھس آیا تھا۔ مگر گھر والوں کی آنکھ کھل گئی اور وہ دیوار پھاند کر بھاگ گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کا پیچھا بھی کیا مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ میرے لیے یہ بات ایک خبر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ شام میں، سوچا ابراہیم سے تفصیل کا علم ہوگا۔ مگر اس روز ابراہیم پانی لے کر نہیں آیا۔ مجھے کہیں سے داستانِ امیر حمزہ کا ایک پرانا نسخہ مل گیا تھا۔ میں ٹیوشن اور کھانے سے فارغ ہو کر رات میں دیر تک اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو ٹن ٹن ٹن اسکول کی گھنٹی بج رہی تھی یا اسکول کی گھنٹی کی آواز ہی سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اسکول پہنچا۔ دعا ختم ہو رہی تھی۔ میں چپ چاپ جا کر امیر علی کے بغل میں کھڑا ہو گیا۔ دعا میں صرف پچیس تیس بچے تھے۔ میں نے امیر علی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ آج بچوں کی تعداد بہت کم ہے؟''

امیر علی نے حسبِ عادت مشتبہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''آپ کو کچھ نہیں معلوم؟''

''کیا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''کل رات بیدار خان دیش مکھ کی بہن کنوئیں میں گر کر مر گئی۔''

''کیا.....!'' میرا منہ پوری طرح حیرت سے کھل گیا۔

''بیدار خان کے گھر پر پولس آئی ہے، پنچ نامہ ہو رہا ہے۔''

میں نے بیدار خان دیش مکھ کی بہن کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر ایک خوبصورت جوان عورت کا ہیولا سا ذہن میں لہرا کر ڈوب گیا۔

''مگر یہ ہوا کیسے؟''

''صحیح بات تو کسی کو نہیں معلوم۔ مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ کل رات ان کے گھر میں جو چور گھسا تھا، وہ کوئی اور نہیں، بیدار خان دیش مکھ کی بہن کا عاشق تھا۔ وہ تو بھاگ گیا مگر بیدار خان نے اس کا نام معلوم کرنے کے لیے اپنی بہن کو بہت مارا پیٹا۔ اس نے نام نہیں بتایا۔ لوگ کہتے ہیں، مار پیٹ سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کر لی۔'' امیر علی چند لمحوں کو رکے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر آہستہ سے سرگوشی کی۔

''اور کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ اسے کنویں میں ڈبو کر مار ڈالا گیا۔ واللہ اعلم۔''

امیر علی ایک دم سے چپ ہو گئے کیوں کہ اسکول انچارج بدرالدین ہماری طرف آ رہے تھے۔

بدرالدین صاحب قریب آ گئے تو انھوں نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آج حاضری بہت کم ہے۔'' پھر خود ہی ہاتھ ملتے ہوئے بڑبڑائے۔

''جو کچھ ہوا، برا ہوا۔ ایک معصوم کی جان چلی گئی۔''

''کیا عمر تھی مرحومہ کی؟'' میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''یہی تیس بتیس کے آس پاس ہوگی۔''

''غیر شادی شدہ تھیں؟''

''یہی تو المیہ ہے۔ بیدار خان کا خوف لوگوں پر کچھ ایسا ہے کہ کوئی رشتہ لے کر آنے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ دو ایک رشتے آئے بھی تو بیدار خان نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہمارے ہم رتبہ نہیں ہیں۔ خدا غرور کو کبھی پسند نہیں کرتا۔''

''مگر جناب بیدار خان دیش مکھ کے غرور کی سزا اس معصوم کو بھگتنی پڑی، خدا کا یہ کیسا انصاف ہے؟''

میں نے قدرے تلخی سے کہا۔ اُن دنوں نیاز فتح پوری کی تصنیف ''من و یزداں'' میرے مطالعہ میں تھی اور میرے خیالات میں دہریت کے جراثیم داخل ہونے لگے تھے۔

''خدا کی مصلحت، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہماری کیا مجال کہ اُس کی تہہ تک پہنچ سکیں۔''

بدرالدین صاحب نے فیصلہ سنا دیا اور آفس روم کی طرف مڑ گئے۔ ہمارے لیے بھی اشارہ تھا کہ اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جائیں۔ ٹیوشن کے بچے جا چکے تھے۔ باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ طبیعت میں عجیب کسل مندی تھی۔ اٹھ کر کچھ پکانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ کوئی خاص بھوک بھی نہیں تھی۔ سوچا دودھ رکھا ہوا ہے، اسی کو گرم کر کے پی لوں گا۔

اتنے میں کسی کی پکار سنائی دی۔ گانو کے بانگی صاحب آواز لگا رہے تھے۔ ''میت تیار ہے۔''

میں ابھی تک کسی بھی میت میں شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس میت میں شریک ہونے کی خواہش کو میں دبا نہیں سکا۔ میں نے چپل پہنے، دروازہ بند کیا اور بیدار خان دیش مکھ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ گلیاں اندھیرے میں ڈوبی تھیں۔ نکڑوں پر گرام پنچایت کی طرف سے مٹی کے تیل کی لالٹینیں لگائی گئی تھیں۔ مگر ان کی روشنی اس قدر مدھم تھی کہ اس میں گلی یا سڑک کی صرف سمت کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوا بیدار خان دیش مکھ کے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہاں گیس کے تین چار ہنڈولے روشن تھے۔ ان ہنڈولوں کی روشنی میں سفید کرتے پاجامے پہنے، لنگیاں باندھے اور سروں پر ٹوپیاں اوڑھے، رومال باندھے کئی پرچھائیاں ڈول رہی تھیں۔ میرے قریب پہنچتے پہنچتے جنازہ اٹھا لیا گیا اور بانگی صاحب ''کلمۂ شہادت'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آگے آگے چلنے لگے۔ اُن کے آگے ایک شخص سر پر گیس کا ہنڈولا لیے چل رہا تھا۔ دو تین لوگ گیس کے ہنڈولے سروں پر اٹھائے جنازے کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ میں بھی جنازے کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔

قبرستان کی کچی سڑک شروع ہو گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ایستادہ تھے۔ جوں ہی جنازہ درختوں کے درمیان سے گزرنے لگا، درختوں کی گھنی چھانو میں بسیرا کرنے والے پرندے پھڑ پھڑانے لگے۔ اُن کی پھڑ پھڑاہٹ سے لگا جیسے پوری فضا میں ایک اضطراب سا پھیل گیا ہو۔ رات کا اندھیرا، سڑک کے دونوں طرف گھنے درختوں کی قطار، گیس کے ہنڈلوں کی روشنی میں

درختوں اور انسانوں کی آپس میں متصادم ہوتی پرچھائیاں، درمیان سے گزرتا ہوا جنازہ، بانگی صاحب کا کلمۂ شہادت کے نعرے کے ساتھ لوگوں کا زیرِ لب کلمہ پڑھنا، پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان سب کے اوپر آسمان میں ٹمٹماتے تارے..... فضا میں عجیب پُراسراریت سی پیدا ہوگئی تھی۔ میں رفتہ رفتہ بھیڑ سے پیچھے ہوگیا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ مجھ سے بھی پیچھے، کافی فاصلے پر کوئی سر سے پانو تک کالا کمبل اوڑھے، لنگڑاتا، لڑکھڑاتا چلا آرہا ہے۔ اب جنازہ قبرستان میں داخل ہورہا تھا۔ جنازہ قبرستان کے ایک گوشے میں بنی چھوٹی سی مسجد کے پاس جاکر رک گیا۔ فضا میں اگربتی، کافور، سبزہ اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ خوشبو ذہن کو طراوت عطا کرنے کے بجائے دل پر عجیب اداسی کی سی کیفیت طاری کررہی تھی۔ جنازے کو نیچے اتارا گیا۔ لوگوں نے جلدی جلدی صفیں بنائیں۔ جنازے کی نماز کی تیاری ہورہی تھی۔ جنھیں نماز میں شریک نہیں ہونا تھا، وہ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ میں نے بھی مناسب جگہ کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر ٹہلتا ہوا سب سے الگ ایک درخت کے نیچے جاکر کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ماسٹر ساب!''

میں نے چونک کر دیکھا، وہی کمبل پوش جو جنازے کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، میرے قریب کھڑا تھا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ابراہیم سقہ تھا۔

''ابراہیم!'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں، ماسٹر ساب، میں ابو ہوں۔'' میں نے محسوس کیا کہ وہ ہلکے ہلکے کانپ رہا ہے۔ اندھیرے میں اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کی، اس کی داڑھی بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو پارہا تھا۔ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ایک بار لڑکھڑا گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ اس کے بدن سے بھاپ سی نکل رہی تھی۔

''ارے تمھیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تمھیں اس حالت میں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔''

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ کانپتا ہوا اکڑوں بیٹھ گیا۔ کپکپی کے ساتھ اس کے منہ سے کراہیں بھی نکل رہی تھیں جیسے اندرونی طور پر اسے کہیں گہری چوٹ لگی ہو۔ اتنے میں جنازے کی نماز ختم ہوگئی۔ لوگ جنازے کو اٹھا کر ایک کھدی ہوئی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے ابراہیم کی طرف مڑ کر دیکھا۔

اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''ماسٹر ساب میری طرف سے بھی یہ مٹھی بھر مٹی قبر میں ڈال دینا۔''

اُس کا ہاتھ کمبل سے باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی دی ہوئی مٹی لے لی اور قبر کی طرف بڑھ گیا، لوگ قبر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ جنازے کا ڈھکن ہٹا کر لوگوں نے میت کو جنازے سے نکالا اور کلمہ پڑھتے ہوئے میت کو قبر میں کھڑے دو شخصوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ دونوں نے میت کو قبر میں لٹا دیا اور لکڑی کے برگوں سے میت کو ڈھک کر قبر کے باہر نکل آئے۔ آس پاس کی مٹی سے جلدی جلدی قبر کو بھرا جانے لگا۔ لوگ اپنی اپنی مٹھیوں میں مٹی لیے ''قل ھواللہ'' پڑھ پڑھ کر قبر پر ڈال رہے

تھے۔ میں نے بھی ابراہیم کی دی ہوئی مٹی قبر پر ڈال دی۔ قبر مٹی سے بھر چکی تھی۔ دو مزدوروں نے پھاوڑے سے مٹی کو سمیٹ کر تربہ بنادی۔ بانگی صاحب نے سبزے کی ایک ٹہنی قبر کے سرھانے گاڑ دی اور فاتحہ پڑھنے لگے۔ فاتحہ ختم کر کے سب لوگ قبرستان کے گیٹ کی طرف مڑ گئے۔ میں نے مڑ کر اس درخت کی طرف دیکھا جہاں ابراہیم سقہ کو چھوڑ آیا تھا۔ مگر اب ابراہیم سقہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ابراہیم کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ لوٹ گیا تھا۔ میں بھی بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے پر لوٹ گیا۔

اُس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ قبرستان کی پُراسرار فضا بار بار میری نیند میں خلل ڈال رہی تھی۔ میں خوف زدہ نہیں تھا مگر ایک بے نام اداسی میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو باہر کچھ شور سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ لوگ زور زور سے باتیں کرتے ہوئے تیزی سے ایک طرف کو جا رہے تھے۔ دو چار لڑکے بھاگتے ہوئے بھی دکھائی دیے۔ میں نیند کے دباؤ سے لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ پھر ایک شخص سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بھائی؟ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

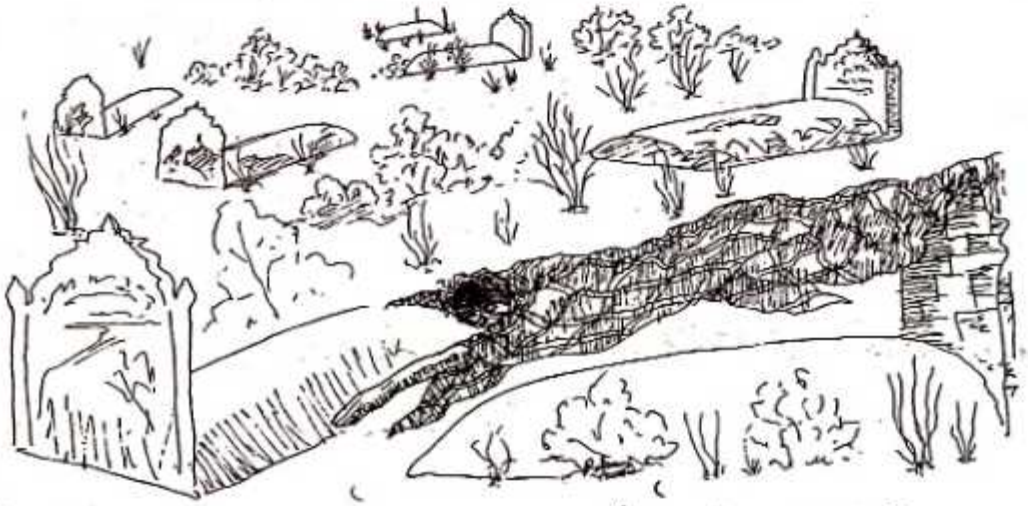

''قبرستان میں کسی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔'' وہ شخص تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میرے ذہن میں ایک خوفناک اندیشے نے سانپ کی طرح پھن اٹھایا۔ میں نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے دو چار چھپاکے مارے اور قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ قبرستان کے چاروں طرف پورا گانو اُمڈا ہوا تھا۔ میں نے بھیڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ رات کی تازہ تربت پر ایک شخص کمبل اوڑھے دونوں ہاتھوں سے تربت کو بانہوں میں سمیٹے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے دور سے پہچان لیا، وہ ابراہیم سقہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور بیدار خان دیش مکھ کے گھر تین چار روز پہلے ہونے والی چوری کی واردات سے لے کر اب تک کے واقعات کی ساری کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ قریب کی تحصیل سے کوئی ایک انسپکٹر اور دو حولداروں کو بلا لایا۔ وہ لوگ بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے قبر کے پاس پہنچے۔ اُن کے ساتھ گانو کا تلاٹھی اور سرپنچ بھی تھے۔

انسپکٹر نے ابرہیم سقہ کو ہلایا ڈلایا۔ مگر وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ مر چکا تھا۔

مجمع میں پہلے تو سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ اُن کی باتیں تو سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر ان

کے چہروں سے رنج، افسوس اور غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُک سکا اور چپ چاپ اپنے کمرے پر چلا آیا۔ بعد میں سنا کہ شہر سے مردہ گاڑی آئی تھی اور ابراہیم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جایا گیا۔ چوں کہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا، اس لیے پوسٹ مارٹم کے بعد شاید شہر کی میونسپلٹی نے لاش کو وہیں کسی قبرستان میں دفن کر دیا ہوگا۔

آج پچیس برس بعد میں پھر اسی قبرستان پر کھڑا ہوں۔ میں تو سیر کو نکلا تھا، پھر یہاں کیسے پہنچ گیا؟ شاید ماضی کی کوئی یاد دامن پکڑے مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ مغرب کی طرف آسمان کی لالی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ آئے تھے۔ قبرستان کی فضا اُن کے شور سے گونج رہی تھی۔ میں نے قبرستان کے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ دور تک کچی پکی قبروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دو تین تازہ قبریں بھی نظر آ رہی تھیں۔

''سر آپ یہاں کھڑے ہیں۔ میں آپ کو ندی کے پُل پر تلاش کر رہا تھا۔''

میں چونک کر مڑا۔ عبدالرزاق مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے تھے۔

''ہاں..... بس یوں ہی سیر کرتے کرتے اِس طرف نکل آیا تھا۔'' میں نے بھاری آواز سے کہا۔

''آپ کا کوئی عزیز اس قبرستان میں دفن ہے کیا؟''

''عزیز؟ ہاں کچھ ایسا ہی سمجھیے۔'' میں نے مُڑتے ہوئے کہا۔

''چلیے..... چلتے ہیں۔''

میں گانو کی طرف چلنے لگا۔ عبدالرزاق میرے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ گانو کی ترقی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ مگر میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ میرے ذہن سے پچیس برس پرانے نقوش ابھی پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔

لفظ و معنی

سقہ	۔	پانی پلانے والا
ریمارک	۔	رائے زنی
لامتناہی	۔	جس کی انتہا نہ ہو
عارضی	۔	وقتی، ہنگامی، وہ چیز جو مستقل نہ ہو
مشک	۔	پانی بھرنے کی کھال
مشکیزہ	۔	چھوٹی مشک
جاذب	۔	پرکشش
منکشف	۔	ظاہر
منہمک	۔	کسی کام میں بہت مصروف

کھنڈت ڈالنا	۔	کسی کام میں خلل ڈالنا
استفسار	۔	دریافت کرنا، پوچھنا
آبائی	۔	موروثی، باپ دادا کی
بسیارخور	۔	بہت کھانے والا
بسیارخواب	۔	بہت سونے والا
تضیع اوقات	۔	وقت گنوانا، عمر رائگاں کرنا
بیاض	۔	وہ کتاب جس میں اشعار لکھتے ہیں، یادداشت کی کاپی
مدوجزر	۔	جوار بھاٹا، اتار چڑھاو
متولی	۔	منتظم، انتظام کرنے والا
متزلزل	۔	ڈگمانے والا، لرزاں
کم سواد	۔	کم حیثیت، نااہل
یک لخت	۔	فوراً
اکتفا کرنا	۔	کافی ہونا، قناعت کرنا
اللہ بیلی	۔	اللہ نگہبان، خدا حافظ
دہریت	۔	الحاد، خدا کو نہ ماننا
کسل مندی	۔	سستی، کاہلی
طراوت	۔	تازگی، ٹھنڈک
زائل	۔	دور ہونے والا

آپ نے پڑھا

☐ یہ افسانہ سلام بن رزّاق کے افسانوی مجموعے 'شکستہ بتوں کے درمیان' سے ماخوذ ہے۔ یہ سماج کے کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کہانی ہے۔ وہ قابلِ مبارک باد ہیں کہ گم ہوتے پیشے اور مٹتی ہوئی زندگیوں کی سانسوں کی ڈور کو اپنے افسانے میں جمع کر کے انھوں نے ایک بڑا تہذیبی فریضہ انجام دیا ہے۔ افسانہ 'ابراہیم سقہ' ایک معمولی اور عام بھشتی کی کہانی ہے۔ شیخ صاحب دھورن گانو میں اسکول کا معائنہ کرنے اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے تشریف لاتے ہیں۔ یہ وہی اسکول ہے جہاں وہ پچیس برس پہلے ایک مدرس کی حیثیت سے مقرر ہوئے تھے۔ اسی گانو میں واحد بھشتی ابراہیم سقہ ہے جو پانی بھرنے کے لیے شیخ صاحب کے یہاں آتا جاتا ہے۔ وہ معمولی شکل وصورت کا انسان ہے اور نہایت غریب ہے۔ سلام بن رزّاق نے ایک معمولی اور عام انسان ابراہیم سقہ کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بنا کر اس کی زندگی کے دکھوں، تکلیفوں، محرومیوں اور حسرتوں کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ ایک خوددار اور محنت کش انسان ہے۔ کسی کے رحم وکرم اور دوسروں

کے ٹکڑوں پر جینا نہیں چاہتا بلکہ محنت کی روٹی کھانا پسند کرتا ہے۔ چوں کہ وہ ایک بیس پچیس برس کا نوجوان لڑکا ہے۔ اس لیے اس کے اندر بھی محبت کے احساسات و جذبات امڈتے ہیں۔ وہ ایک اونچے طبقے کی لڑکی سے محبت بھی کرتا ہے لیکن غریبی کی وجہ سے اپنی محبت کو نہیں پا سکا۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس لڑکی کی موت کے بعد اس کی قبر پر اپنی جان دے دیتا ہے۔

- اس افسانے میں ایک بھشتی کی کہانی بیان ہوئی ہے جو بہ ظاہر ایک عام اور معمولی آدمی نظر آتا ہے مگر اس میں جس نوع کی قابلِ توجہ، خاص اور غیر معمولی خصوصیتیں پوشیدہ ہیں، ان پر سے ایک کے بعد ایک پردہ اٹھانے اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کے انجام کی پیش کش میں بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا اظہار سلام بن رزّاق نے کیا ہے۔
- معمولی شکل و صورت کا یہ غریب بھشتی اپنی زندگی کی تکلیفوں، محرومیوں اور حسرتوں سے آگاہ ہے۔ وہ خوددار اور محنتی ہے۔ کسی کے رحم و کرم اور دوسروں کے ٹکڑوں پر جینا نہیں چاہتا ہے۔ یہ تمام باتیں کہانی کے بیان کرنے والے (حاضر راوی) کی معرفت کئی واقعات اور اس کردار کے مختصر مکالموں کے ذریعہ عمدہ فن کاری سے اس افسانے میں بیان ہوئے ہیں۔ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خود اس کردار کے اندرونی اور پوشیدہ احساسات کی ایمائی اور اس کے عشق کے الم ناک انجام کی ڈرامائی پیش کش میں سلام بن رزّاق نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔
- واقعات کا بیان بہت خوبی کے ساتھ ہوا ہے۔ ان میں ربط اور تسلسل ہے۔ ہر واقعہ ایک دوسرے سے کڑی کی طرح جڑا ہوا ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم افسانہ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی ڈرامے کا سین دیکھ رہے ہیں۔ افسانے کی ابتدا بھی ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے۔ آخر میں جنازے کو قبرستان لے جاتے وقت کا منظر تو چلتا پھرتا ڈراما ہی ہے۔ کرداروں کے ذریعہ جو مکالمے ادا ہوئے ہیں، وہ سادہ اور عام فہم ہیں۔ ابراہیم کے ذریعے جو مکالمے ادا ہوئے ہیں، وہ خاص اسی طبقے کی زبان میں ہیں جو اس کے کردار کو زیادہ حقیقی بنا دیتے ہیں۔
- یہ کہانی ابراہیم سقّہ کی طرح ہی سادہ تکنیک میں ہے۔ شیخ صاحب کے حافظے اور یادوں میں یہ کہانی ابھرتی ہے۔ گویا فلیش بیک تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں شعور کی رو کا استعمال کر کے افسانہ نگار نے ماضی اور حال کے صیغوں کو ملا دینے میں کامیابی پائی ہے۔ ابراہیم سقّہ کوئی مختصر نوشتہ نہیں ہے لیکن کیا مجال کہ اس کی زندگی سے کسی پڑھنے والے کی آنکھ ہٹ سکے۔ اصل واقعے اور زندگی پر اتنا ارتکاز حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اتنی وحدت، اس قدر ارتکاز اور جان ہی جان میں ابراہیم سقّہ کی طرح گھلنا شاید مختصر افسانے کا نقطۂ عروج ہے۔
- اس کہانی کا موضوع سماج میں رائج ناہمواری ہے۔ ہندستان کو آزاد ہوئے تقریباً ساٹھ سال ہو گئے لیکن پھر بھی سماج میں امیری، غریبی اور ذات پات کا چلن ختم نہیں ہوا ہے۔ آج بھی کوئی نچلے طبقے کا انسان اونچے طبقے کے فرد کے ساتھ محبت جیسے اپنے پاکیزہ رشتے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسے سماج کی پابندیوں کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سماج اس رشتے کو قبول نہیں کرے گا اور اس پر پابندیاں عائد کر دی جائیں گی یا وہ سماج سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ افسانہ نگار سلام بن رزّاق نے بہت ہی خوب صورت انداز میں سماج میں رائج اس خرابی کو اپنے افسانہ ابراہیم سقّہ میں دکھلایا ہے۔ انھوں نے ابراہیم سقّہ کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ابراہیم سقّہ میں خودداری ہے، وہ محنت کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے، اس سے پورے گانو والے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ گانو کے چودھری بیدار خاں دیش مکھ کی بہن سے محبت کا اعلان پورے سماج میں نہیں کر سکتا۔ آخر اس محبت میں عاشق اور معشوق دونوں کی جان چلی جاتی ہے۔
- سلام بن رزّاق کی یہ کہانی اپنی زبان، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک عمدہ کہانی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کا موضوع گرچہ بہت

نیا نہیں ہے لیکن افسانہ نگار نے اس کو جس خوب صورتی سے برتا ہے، وہ اس موضوع کو بھی تازہ اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ یہ افسانہ نگار کی فن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کہانی بابو گوپی ناتھ، ہتک (منٹو)، لاجونتی (بیدی)، کالو بھنگی (کرشن چندر)، کالے شاہ (غیاث احمد گدی) وغیرہ جیسی کردار اساس شاہ کار کہانیوں کی یاد دلاتی ہے۔ ان کہانیوں کے مرکزی کرداروں کی طرح اس مرکزی کردار 'ابراہیم سقہ' کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

آپ بتائیے

1. سلام بن رزّاق کو کس سال ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا؟
2. کن دو زبانوں کے ادب سے سلام بن رزّاق سے ادبی تعلق ہے؟
3. سلام بن رزّاق کے تین افسانوں کے نام لکھیے۔
4. کردار اساس چار افسانوں کے عنوانات اور ان کے لکھنے والوں کے نام لکھیے۔

مختصر گفتگو

1. ابراہیم سقہ کی تعلیم کہاں تک ہوئی تھی؟
2. ابراہیم کس سے محبت کرتا تھا؟
3. اس افسانہ میں کس گانو کا قصہ بیان کیا گیا ہے؟
4. عبدالرّب اور عبداللہ بھینسا کون تھے؟
5. افسانہ 'ابراہیم سقہ' کے خالق کون ہیں اور یہ کس مجموعے سے اخذ کیا گیا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. ابراہیم سقہ کے مرکزی کردار کا سراپا بیان کیجیے۔
2. افسانہ 'ابراہیم سقہ' کے پیش نظر سلام بن رزّاق کی جذبات نگاری پر روشنی ڈالیے۔
3. ابراہیم سقہ کی موت کن حالات میں ہوئی؟ تفصیل سے بتائیے۔
4. 'سماج کے ایک معمولی فرد کو مرکزی کردار بنا کر سلام بن رزّاق نے قاری کو اندر سے جھنجھوڑ دیا ہے۔' اس قول کی وضاحت کریں۔
5. افسانہ 'ابراہیم سقہ' کے وحدت تاثر پر ایک نوٹ لکھیے۔
6. سلام بن رزّاق کی افسانوی زبان پر تبصرہ کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سلام بن رزّاق کے اہم افسانوں کو یکجا کیجیے۔
2. سماج کے کمزور طبقے اور عام لوگوں کے حالات پر مرکوز اہم افسانوں اور ان کے تخلیق کاروں کی فہرست بنائیے۔

خط

خط، خیریت کی ترسیل اور تبادلۂ خیالات کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ اُسے لکھا جاتا ہے جو حاضر نہیں ہوتا۔ انسان اپنی کسی ضرورت سے، چاہے وہ ذاتی ہو یا قومی، خط لکھتا ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انسان نے جب سے لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ قائم کیا، اسی زمانے سے دنیا میں خط آنے جانے کا رواج قائم ہوا ہوگا۔ جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوا اور ترقی، خوش حالی اور تحفظ کے سبب لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگے، شاید انھی دنوں قبیلے کے احوال جاننے اور بتانے کے لیے خط کا پہلے پہل استعمال کیا گیا۔

عہدِ جدید میں بالخصوص مغربی تعلیم کے فروغ کے زمانے میں مکتوب نویسی کا باضابطہ سلسلہ اس وجہ سے قائم ہوا کیوں کہ ان خطوط کے لانے اور لے جانے کو ادارہ جاتی استحکام ملا۔ ہندستان میں بھی سولھویں صدی کے آغاز میں شیر شاہ سوری نے محکمۂ ڈاک جیسی ابتدائی تنظیم کو کامیابی کے ساتھ قائم کیا تھا۔ مغل حکومت کے زمانے میں فارسی میں مکتوب نویسی کا رواج تھا۔ علماے کرام، بادشاہ، اُمرا اور رؤسا یا ادبا و شعرا کے جو خطوط آج محفوظ ہیں، وہ سب کے سب فارسی میں ہیں۔ یہاں تک کہ اردو کے شعرا بھی بہ شمول مکتوب نویسی تمام نثری کام فارسی میں ہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اردو میں اہم شعرا و ادبا کی طرف سے لکھے جانے والے خطوط کی تاریخ مرتب کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1846 کے بعد ہی غالب نے اردو میں اپنے احباب کو خطوط لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں غلام غوث بے خبر بھی اردو مکتوب نویسی کی طرف آئے۔ غالب نے اپنی زندگی کی آخری دو دہائیوں میں تقریباً 900 رخطوط اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے نام روانہ کیے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے۔ غالب کے بعد سرسیّد، حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد، سیّد سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، پریم چند، فیض احمد فیض، صفیہ اختر وغیرہ کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یہ مکتوبات اطلاعات کا بڑا خزینہ ہیں اور ان سے زندگی کے سینکڑوں پوشیدہ پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں۔

خط ذاتی نوعیت کی چیز ہے۔ مکتوب نگار کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسے لکھ رہا ہے، وہی اسے دیکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیش تر مکتوب نگار اپنے دل کی وہ باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جنھیں دوسرے مواقع پر اُسے پیش کرنے میں دشواری ہو سکتی تھی۔ جذبات کی جس رَو میں مکتوب نویس نے خط لکھا اور اُسے روانہ کر دیا، وہ خط چُھوٹا ہوا تیر ہوتا ہے۔ مکتوب نگار جس زمانے یا جس مقام سے خط لکھتا ہے، وہ اپنے حالات بیان کرتے ہوئے بے ارادہ اپنے زمانے اور دوسروں کے احوال بھی متوازی طور پر رقم کرتا چلتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی اہم شخصیت کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے خطوط نہایت ضروری اور سنجیدہ ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ غالب کے خطوط اردو کی ادبی تاریخ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں جہاں سچائی اور بَرملا اظہارِ بیان نے اپنی معراج حاصل کر لی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام محی الدین احمد تھا۔ 1888 میں وہ مکّہ مکرّمہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مولانا خیر الدین مدرّس تھے۔ ان کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا۔ بچپن میں ہی والد کے ساتھ مولانا آزاد ہندستان آ گئے اور کلکتہ میں مستقل قیام ہو گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔ بعد میں مولوی محمد یعقوب، مولوی نظیر الحسن ایٹھوی، مولانا سعادت حسین وغیرہ سے انھوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ 15 برس کی عمر میں ان کے والد نے اپنے گھر میں انھیں طلبہ کا ایک حلقہ، درس و تدریس کے لیے سونپ دیا جسے وہ کامیابی سے سنبھالتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے شعر و شاعری، ادبی صحافت کی طرف قدم بڑھائے۔ ان کی تخلیقات ملک کے موقر رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے لگی تھیں۔ 1903 میں محض 15 برس کی عمر میں انھوں نے اپنی ادارت میں 'لسان الصدق' جیسا رسالہ جاری و شائع کر دیا۔ اسی عمر میں انھیں مختلف شہروں میں مذہبی اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا رہا۔ بعد میں وہ 'الندوہ' اور 'وکیل' کے شعبۂ ادارت سے بھی متعلق ہو گئے۔ 07-1906 میں محترمہ زلیخا بیگم سے مولانا کی شادی ہوئی اور 1908 میں ان کے والد کا انتقال ایک مختصر بیماری کے بعد ہو گیا۔ 1908 میں ہی مولانا مصر، ترکی اور عراق کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ 1912 میں انھوں نے اپنا اخبار 'الہلال' کلکتہ سے نکالا، جسے بعد میں ہندستان کی جنگ آزادی کا سب سے معتبر ترجمان مانا گیا۔ لیکن 1914 میں حکومتِ وقت کے عتاب کے سبب 'الہلال' بند ہو گیا۔ 16-1915 میں 'الہلال' کے بدل کے طور پر 'البلاغ' شائع ہوا۔ حکومت وقت کو مولانا آزاد کی تحریریں ناگوار معلوم ہوئیں اور اس نے 'البلاغ' کو نہ صرف بند کرنے پر مجبور کیا بلکہ مولانا آزاد کو صوبے سے باہر جانے کا حکم بھی دے دیا۔

اوائل اپریل 1916 سے وسط جنوری 1920 تک تقریباً 44 مہینے مولانا آزاد رانچی میں نظر بند رہے۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد وہ 1920 میں مہاتما گاندھی کے بلاوے پر کانگریس اور خلافت تحریک کے مشترکہ اجلاس میں شریک ہوئے اور پھر سیاسی زندگی سے وہ کبھی الگ نہیں ہو سکے۔

محض 35 برس کی عمر میں مولانا آزاد 1923 میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس سے کم عمر میں کانگریس کی صدارت کسی شخص کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح 1940 سے 1946 کے دوران لگاتار چھے برسوں تک وہ کانگریس کے صدر رہے۔ اتنے دنوں تک مسلسل کانگریس کی صدارت بھی کسی ایک شخص کے حصّے میں نہیں رہی۔ مولانا کی صدارت کے دوران ہی بھارت چھوڑو تحریک اور کیبینیٹ مشن کے واقعات ہوئے۔ مولانا آزاد ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم بنائے گئے اور اپنی وفات 22 فروری 1958 تک وہ اس عہدے پر قائم رہے۔ اس دوران وزیر اعظم کے ملک سے باہر رہنے کے موقع سے وہ انچارج وزیر اعظم کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ملک میں تعلیم کا جو جدید ڈھانچہ قائم کیا، وہی کم و بیش آج بھی ترقی پا رہا ہے۔

مولانا آزاد صرف سیاست داں یا خطیب نہیں تھے۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ تذکرہ، (خودنوشت)، ترجمان القرآن (تین جلدیں)، انڈیا ونس فریڈم اور غبار خاطر ایسی کتابیں ہیں جن کی بدولت مولانا آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب اور منفرد نثر نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے خطوط اور مضامین کے متعدد مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

غبارِ خاطر

تین خطوط

قلعۂ احمد نگر

29 اگست، 1942

صدیقِ مکرم

وہی چار بجے صبح کا جاں فزا وقت ہے۔ چاے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت دراز نفسی کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ سن سکتے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روے سخن آپ کی طرف ہے :

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے، وہی حال میرا ہے۔

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ ان سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نجی خط و کتابت روکی نہیں جاتی تھی۔ اخبارات دیے جاتے تھے اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے، مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پانو میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دنیا میں بس رہا ہے، جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا۔

زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورد تھا

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں، بلکہ صدائیں بھی بہ یک دفعہ رک گئیں۔

اچانک ایک نئی دنیا میں لا کر بند کر دیے گئے جس کا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا، اور جس کی ساری مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی، اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔

گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں ہے اب

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا، تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی

اور تیزی اور شدّت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے، مگر فکر و تصوّر کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں، تو کون ایسا زیاں عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو :

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجبِ شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا، اس کا آرزومند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔

ابتدا ہی سے طبیعت کچھ ایسی ہوئی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوئر ضرور دیکھا ہوگا، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جایئے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے : 'اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟' یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو بری پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا، اور شاید اب بھی ہو، میں نے چن لیا تھا۔ کیوں کہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے۔

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا، لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔

والد مرحوم میرے اس شوقِ علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے۔ یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا۔

طبیعت کی اس افتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیرتے ہیں، تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اور زیادہ منّت گزار ہونے لگتا ہے کیوں کہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے، میرے لیے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں، تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی،

اضطراب وتکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا۔

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے، تو اس حالت کی رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں۔ میرے لیے یکسوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کرسکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے، تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہوسکتی ہے! اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش، ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے، حاصل کی جاسکیں۔

میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں، نہ اسے حسن وخوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم وانجمن کا حریف نہ ہو، اور صحبت واجتماع کی جگہ خلوت وتنہائی میں راحت محسوس کرے۔ لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا نہیں جاسکتا۔

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں۔ گیارہ رفیق ساتھ ہیں)۔ لیکن چونکہ اس میں سے ہر شخص ازراہِ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے، اس لیے حسب دل خواہ اور (خود) مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرہ سے نکلنا پڑتا ہے کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے اور چائے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہے۔ باقی تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے۔ زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے، تو کیا مضائقہ! وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر ونظارہ میں محو رہتا ہوں۔

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ صرف دو کتابیں میرے ساتھ آگئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں، اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہوگیا اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا، تو لکھنے کے سامان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے۔

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں، یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں :

بیکاریِ جنوں میں ہے، سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا، وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائیں گے۔ قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جاسکتا ہے، لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جاسکتی۔ چیتہ خان نے یہاں کے فوجی مس (Mess) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوالیا تھا۔ وہ اس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو

ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی، پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا، بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے۔

میں نے چیتہ خان سے کہا کہ اگر 9 اگست سے 27 تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں، تو منگوا دے، اس نے ڈھونڈ وایا، تو بہت سے پرچے مل گئے، رات دیر تک انھیں دیکھتا رہا تھا۔ مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی۔

میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔

ابوالکلام آزاد

(ii)

قلعۂ احمد نگر

17 دسمبر، 1942

صدیق مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔ وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے، ختم ہو گئی۔ اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گراں مایہ سے آشنا نہیں۔ مجبوراً ہندستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں۔

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی، بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے۔ سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہونا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں، لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی، اس کے لیے وسائل میں غور فرمایئے، میرا رخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے۔

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جا رہی ہے، لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہِ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان اور ایران۔ وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گزرا۔ مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندستان میں چائے کا رواج انھیں کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعت سئیہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ اب

انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں، انیس ون چانس سکتا ہے، لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوہ بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ

ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے اور اس بارے میں بھی ایک عجیب عالم گیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیے اور کس کس کو سمجھائیے۔

عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں، چائے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کر کے دوسری پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردّوکد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے، سیلون کی چائے بہتر ہے، دوسرا کہتا ہے: دارجلنگ کی بہتر ہے۔ حالاں کہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں، وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں۔

دراصل یہ عالم گیر غلطی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندستان کے بعض انگریز کاشت کاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا، مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اس کو کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے:

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنسِ کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹیے، سنتا کون ہے۔

معاملہ کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالم گیر فریب کی لپیٹ میں آ گئے اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھاس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں۔

نوعِ انسان کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے جمیعتِ بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقل مند آدمی اِکا دُکا ہوگا، بھیڑ بے وقوفوں ہی کی رہے گی (ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے، انکار پر آئیں گے، تو مسیح کو سولی پر چڑھا دیں گے۔)

سب سے اہم مسئلہ شکّر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اور نوعیت کے لحاظ سے بھی۔ جہاں تک مقدار کا تعلّق ہے، اسے میری محرومی سمجھیں، یا تلخ کامی کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصّہ ملا ہے۔ نہ صرف چائے میں، بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں

کر سکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی، وہی میرے لیے بدمزگی ہوگئی۔ کھاتا ہوں تو منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذت مٹھاس ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہوا ہو، مگر میں اوپر سے چھڑک دوں گا۔ میں صباحت کا نہیں، ملاحت کا قتیل ہوں۔

شکّر کے معاملے میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں، اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں مگر یہ نکتہ انھوں نے پالیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمو شکّر پر ترجیح دیتے تھے، کیوں کہ قند صاف ہوتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکّر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہا کا کیا حال ہے؟

اگر پوچھیے کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہوا تو میں بلا تامل انگریزوں کا نام لوں گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالم گیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کی منّت پذیر ہے تاہم یہ نزدیکان بے بصر حقیقتِ حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقت لطافت و کیفیت کا ذوق انھیں چھو بھی نہیں گیا۔ جب اس کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہوگا، معلوم ہے۔

انھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا، مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اوّل تو ہندستان اور سیلون کی سیاہ پتّی ان کے ذوقِ چائے نوشی منتہائے کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دیں گے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندہ مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرینِ فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انھی پتّیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے تو اس کے لیے ماہرینِ فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے، جو پتّی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے، چائے ہے۔ اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائے گا۔

اگرچہ فرانس اور برِّ اعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا، تاہم اعلا طبقہ کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اور ان کا ذوق بہر حال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چائے پئیں گے، اور اگر سیاہ چائے پئیں گے بھی تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے! لیموں کی ایک قاش کے ساتھ، جو چائے کی لطافت کو اور نقصان نہیں پہنچاتی، بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کم بخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے۔

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چائے وہیں سے آتی ہے۔ ایک مدّت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں، وہ 'وھائٹ جیسمین' (White Jasmine) کہلاتی ہے یعنی 'یاسمنِ سفید' یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہیے کہ 'گوری چنبیلی'

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں! لوگوں نے آتشِ سیّال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔

BSTBPC-2018

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے۔ اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلّور فنجان میں گھول دی ہوں۔

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی تو اس کا اثر چائے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا۔ اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبے مل گئے تھے اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا تو ایک ڈبہ ساتھ تھا۔ ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئی سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا اور پھر قبل اس کے کہ ختم ہو، گھر والا ڈبہ بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو، لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے۔ عمریں گزر جائیں۔ پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستان کیف و سرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پری کی نگری۔

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لچو و پچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا بے سود تھا۔

مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہو جانے پر آیا۔ چیتہ خان نے یہاں دریافت کرایا، پونا بھی لکھا، لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے، دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک ہفتہ سے وہی ہندستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں۔

آج کل چینی ہندستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوراں کھل گئے ہیں۔ چوں کہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے، اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوران کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہوگی۔ اس نے خالی ڈبہ بھیج کر دریافت کرایا۔ انھوں نے ڈبہ دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن تمھیں یہ ڈبہ کہاں سے ملا؟ اور اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آ رہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا، اس نے ہر چند باتیں بنائیں، مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چنگ کائی شیک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آ رہی ہے اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

ابوالکلام آزاد

(iii)

قلعۂ احمد نگر

11 اپریل 1943

صدیقِ مکرّم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں، بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا، کمرہ میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 1941 میں جب میں نینی جیل میں مقیّد تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ سفر میں رہا۔ حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا۔ مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے اداروں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر

بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ 3 اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو 13 اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشک بار تھا۔

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت تک ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب کا اظہار ہوگا۔ تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ 1916 میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا، بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو 17 ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ 15 فروری کو مجھے ایک خط 2 فروری کا بھیجا ہوا ملا، جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے بہ ذریعہ تار مزید صورتِ حال دریافت کی تو ایک ہفتے کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

22 مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم، جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا، وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چوں کہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے، اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جا سکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آ سکتا ہے کیوں کہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر

تار بھیجنا ہو، تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاسکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئیں ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی نہیں سمجھی گئی۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چوں کہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے، اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا، اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو 23 مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا، وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا، اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقرّرہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جوں ہی خطرناک صورتِ حال کی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمّہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات سے گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا، ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں، مگر جسم کو تھکا دیتی ہے، وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔

بالآخر 9 اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی

تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہوگئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا، لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقا کا جو طرزِ عمل رہا، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں، تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جوں ہی انھیں معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کرلیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کرلی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پانو شل ہوگئے ہیں۔

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے، جب سے آیا ہوں، سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہوگیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لا منی عندالقبور علی البکا — رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رایته — لقبر ثوی بین النوی فالد کادک
فقلت له ان الشجا یبعث الشجا — فدعنی، فهذا کله قبر مالک

اب قلم روکتا ہوں، اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی، تیرے فسانے میں

ابوالکلام آزاد

لفظ و معنی

(ا)

جاں فزا — دل کو خوش کرنے والا، مسرّت انگیز
فنجان — چھوٹی پیالی
درازنفسی — طول کلامی
طبع — طبیعت، فطرت
شیون — ماتم، آہ وزاری

نورد	۔	مصدر نوردن کا اسم فاعل، سفر کرنے والا
صریح	۔	صاف، آشکار
پہنائی	۔	چوڑائی، پھیلاو
زیاں	۔	نقصان
علائق	۔	علاقہ کی جمع، بکھیڑے، تعلقات
انقطاع	۔	کٹ جانا
گریزاں	۔	بھاگنے والا
ترغیب	۔	رغبت دلانا، اکسانا، بہکاوا
بسااوقات	۔	بہت دفعہ، اکثر مرتبہ
رجوع	۔	راغب ہونا، رغبت، میلان
اضطرار	۔	بے اختیاری، مجبوری
افتاد	۔	فطرت، مصیبت
یک سوئی	۔	اطمینان، فرصت
خامہ فرسائی	۔	لکھنا
معدوم	۔	فنا کیا گیا، ناپید
غلغلہ	۔	ہنگامہ، شہرت، دھوم

(۲)

شورش	۔	فتنہ، فساد، بلوہ
سرمستی	۔	متوالا پن
آشوب	۔	پریشانی، فتنہ وفساد
آسودگی	۔	آرام، راحت
جنس	۔	سامان، چیز
گراں مایہ	۔	قیمتی
تسمیہ	۔	نام رکھنا
ابنائے زمانہ	۔	زمانے کے لوگ، زمانہ ساز لوگ
فرع	۔	ٹہنی، شاخ
اصل الاصول	۔	جڑوں کی جڑ، اصلی بات

تصریح	-	واضح کرنا، تشریح، تفصیل
جوہرِ لطیف	-	ایسا نفیس مادّہ جو انسانی آنکھ کو نظر نہ آ سکے
کثافت	-	گاڑھا پن، غلاظت
بدعت	-	نئی رسم، دین میں کوئی نئی بات نکالنا
سیہ	-	برائی، بدی
ردّوکد	-	جھگڑا، ضد اور بحث
مرطوب	-	تر، گیلا
کاشت	-	کھیتی
ارزاں	-	سستا
نوع	-	قِسم، ذات، جنس
اجماع	-	اتفاقِ رائے
نوعیت	-	قِسم، خصوصیت
تلخ کامی	-	ناکامی، نامرادی
صباحت	-	گوراپن، خوب روئی
ملاحت	-	نمکینی، سانولا پن
ذی حِس	-	جاندار، احساس رکھنے والا
چنداں	-	اس قدر، زیادہ، بہت
نکتہ	-	باریکی، تہ کی بات
قند	-	شکر، کھانڈ
خیرہ	-	تاریک، سرکش، چکاچوندھ
منّت پذیر	-	احسان مند، احسان ماننے والا
لطافت	-	عمدگی، پاکیزگی، صفائی
مقلّد	-	تقلید کرنے والا، پیرو
منتہیٰ	-	انتہا کو پہنچا ہوا
دقیقہ	-	مشکل، باریکی
بلّور	-	ایک چمک دار اور معدنی جوہر، صاف، شفاف
چارہ سازی	-	امداد

ہم مشرب	-	ایک ہی طریقے کا، ایک ہی مسلک کا
قانع	-	جو مل جائے اس پر راضی رہنے والا

(۳)

افتاد	-	فطرت، مصیبت
افسردہ خاطر	-	بجھے ہوئے دل والا
استقامت	-	کسی امر پر مضبوط ہونا، استقلال
محل	-	منزل، قصر
ایما	-	اشارہ
انقیاد	-	تابع ہونا، فرماں برداری، پابندی
شل ہو جانا	-	سُن ہو جانا

آپ نے پڑھا

- ابوالکلام آزاد نے ہندستانی سیاست کے نہایت نازک موڑ پر غبارِ خاطر کے خطوط لکھے۔ بھارت چھوڑو تحریک (1942) کے دوران قلعۂ احمد نگر میں جیل کی چہار دیواری میں قید کے دوران اپنے اکیلے پن سے مقابلہ آرائی میں انھوں نے اپنے صدیق مکرم یعنی حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام چوبیس خطوط لکھے۔ یہ خطوط کسی وجہ سے بھیجے نہیں جا سکے اور رہائی کے بعد اس کی اشاعت کا فیصلہ ہوا۔ اس اعتبار سے دنیا میں شاید یہ پہلی مثال ہو کہ جس کے نام خط لکھے گئے ہوں، اسے ملنے اور پڑھنے سے پہلے سارا جہاں پڑھ لے۔
- غبارِ خاطر کے خطوط کو اکثر و بیشتر نقاد خط کے بجائے انشائیہ یا مضامین کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ خط کے لیے جو سب سے اہم بات ہے، کہ دو لوگوں کے دلی احوال وہاں درج ہوتے ہیں، غبارِ خاطر میں اکثر و بیشتر غائب ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ سارے خطوط پڑھنے کے باوجود مکتوب الیہ کے بارے میں تھوڑی سی بھی معلومات نہیں بہم پہنچتیں۔
- غبارِ خاطر پر نقادوں نے یہ الزام عاید کیا ہے کہ ان خطوط میں خود خط لکھنے والے کے دل کی کیفیت کا بہت کم پتا چلتا ہے۔ ایک اور اعتراض غبارِ خاطر کے سلسلے میں بالعموم یہ ہوتا رہا ہے کہ ان خطوط میں کانگریس کے صدر اور ایک معتبر سیاسی رہنما کے طور پر مولانا آزاد کی شبیہ نہیں ابھرتی ہے۔ حالاں کہ وہ زمانہ سیاسی بھونچال کا تھا اور ہندستانی سیاست ایک فیصلہ کن موڑ تک پہنچ چکی تھی۔
- آپ نے گزشتہ صفحات میں جو خطوط پڑھے ان سے یہ اندازہ مل چکا ہوگا کہ یہ کچھ الگ انداز کے خطوط ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مکتوب نگار ہی ساری گفتگو کو شروع کرنے والا اور خاتم بھی ہے۔ کسی دوسرے کی کوئی بات یا کسی موضوع پر پوچھے گئے کسی امر کا جواب کہیں نہیں ملتا۔
- ان خطوط میں ایسا ہرگز نہیں کہ مولانا آزاد کی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آگئی ہو۔ ان کی انانیت کو ہی اگر ملحوظ رکھیں تو ان خطوط میں یہ بات بار بار ابھرتی ہے اور مزاج کی ایسی انفرادیت پسندی آخر ان میں کیسے گھر کر گئی، اس بات کی تو ترتیب وار تفصیل ان خطوط

میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی زمانے سے ہی وہ کس طرح عام بچوں کے انداز میں نہیں جیتے تھے اس کے بارے میں خود مولانا کے بیانات ان خطوط میں موجود ہیں۔ پہلے خط کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چھپن برس کی عمر میں مولانا آزاد جیل کی تنہائی میں اپنی گزری ہوئی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے، بالخصوص اپنی نشوونما پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال رہے ہیں۔ ایک طرح سے اپنی زندگی کا یہ لیکھا جوکھا ہے۔

- پہلے خط میں ہی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ صبح کا وقت اور چائے کا ساتھ مولانا آزاد کو کس قدر مرغوب ہے۔ دوسرے خط میں مولانا آزاد اپنی چائے نوشی کے ذکر کے ساتھ اس کی قسموں، اور مختلف ملکوں میں اس کے پینے کے انداز اور ملکوں ملکوں میں تغیر کو موضوع بناتے ہیں۔ چائے نوشی سے رغبت اپنی جگہ لیکن چائے کے سلسلے سے اچھی خاصی معلومات رکھنا اور ایک دل پسندی کے ساتھ انھیں صفحے پر اتار دینا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ ایک نہایت معمولی موضوع پر مولانا آزاد نے نہایت صراحت سے اس طرح سے اپنی باتیں پیش کی ہیں کہ کئی صفحات بامقصد انداز میں تمام ہو جاتے ہیں اور سلسلۂ خیال قائم رہتا ہے۔ غبارِ خاطر میں بہت سارے خطوط مولانا آزاد کی فلسفہ طرازیوں کے سبب یاد رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ خط اچھی خطوط کے ساتھ ساتھ ہر پڑھنے والے کو یاد رہتا ہے۔ جیسے مولانا آزاد کی چائے نوشی ایک طلسمی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ خط ایک جادوئی دنیا کی سیر کراتا ہے۔
- غبارِ خاطر سے جو تیسرا خط شامل ہے، موضوعاتی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ مولانا آزاد کی اہلیہ محترمہ زلیخا بیگم کی وفات قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران ہوئی تھی۔ ان کی موت کے بعد ہی مولانا آزاد کلکتہ جا سکے۔ یہ خط وہاں سے واپسی پر سپردِ قلم ہوا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت اندر سے کتنی نرم اور پگھلنے والی ہے، اس کا اندازہ اس خط کے جملوں سے ہو سکتا ہے۔ انانیت اور مزاج کی تندی یہاں بھی کم نہیں ہے لیکن تھوڑے سے لفظوں میں اور زیادہ سے زیادہ بین السطور میں ایک تڑپتے، بے کس اور بے بس، ہمارا اور دکھی انسان کی طرح وہ دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا آزاد کی شخصیت کا یہ ایسا رخ ہے جو پہلے کبھی سامنے نہیں آ سکا۔ یہ خط جب ختم ہوتا ہے، اس وقت رقت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
- مولانا آزاد کے ان خطوط کی زبان پر غور کیجیے تو اس کی دل کشی اور دل آویزی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سادہ سے الفاظ ہیں۔ عربی اور فارسی کی تراکیب سے بہر طور گریز کی کوشش موجود ہے۔ لیکن گفتگو کا ایسا ڈھب ہے جس میں فلسفہ طرازی، نیم رومانی کیفیت، عالمانہ طور، دقیق مسئلوں میں پر از منطق بات چیت کا انداز اور روانی و شگفتگی کے علاوہ، بیان کے ایک انوکھے پن کے ساتھ مولانا آزاد بہ نفسِ نفیس موجود ہیں۔ اسی لیے غبارِ خاطر اردو کی اپنے ڈھنگ کی واحد کتاب کے طور پر یاد رکھی جاتی ہے اور مولانا آزاد کی زبان دانی اور اسلوب کا سب سے شفاف نمونہ ہے۔

آپ بتائیے

1. غبارِ خاطر کس زمانے کی تصنیف ہے؟
2. غبارِ خاطر میں کتنے خطوط ہیں؟

3. صدیقِ مکرّم کون ہیں؟
4. غبارِ خاطر کے خطوط کس جیل میں لکھے گئے؟
5. مولانا آزاد کی تین کتابوں کے نام بتایئے۔
6. مولانا آزاد کس ملک میں پیدا ہوئے؟
7. مولانا آزاد کا سالِ وفات کیا ہے؟
8. مولانا آزاد پہلی بار کس عمر میں کانگریس کے صدر ہوئے؟
9. مولانا آزاد کے تین اخبارات کے نام بتائیں؟
10. مولانا آزاد کون سی چائے پیتے تھے؟

• اس خط میں

- ❑ 'میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔'
- ❑ 'یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم، کس کی ہے، جب سے آیا ہوں، سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا۔'
- ❑ 'ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں، وہ 'وھائٹ جیسمین' کہلاتی ہے۔ یعنی 'یاسمنِ سفید' یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہیے کہ 'گوری چنبیلی'۔ اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں! لوگوں نے آتشِ سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔ لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے، جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلّوریں، فنجان میں گھول دی ہوں۔'

اوپر لکھے تینوں اقتباسات کی ان کے سیاق و سباق میں 150-150 الفاظ میں تشریح کیجیے۔

مختصر گفتگو

1. مولانا آزاد کی نثر نگاری کی خصوصیات بتایئے
2. مولانا آزاد کی حیات پر ایک سو لفظوں میں ایک نوٹ تیار کیجیے۔
3. مولانا آزاد نے ہندستانیوں کی چائے کو سیّال حلوہ کیوں کہا ہے؟
4. آزاد نے اپنی پسندیدہ چائے کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، انھیں اختصار سے لکھیے۔
5. آزاد نے جیل کے احاطے کی کسی پرانی قبر کو دیکھنے کے بعد کن کیفیات کا اظہار کیا ہے؟
6. تیسرے خط کو پڑھتے ہوئے مولانا آزاد کی بیگم کی کیسی شبیہ ابھرتی ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. غالب اور ابوالکلام آزاد کا بہ حیثیت مکتوب نگار موازنہ کیجیے۔
2. ابوالکلام آزاد کے صاحبِ طرز نثر نگار ہونے کی دلیلوں کے ساتھ ایک مختصر مضمون لکھیے۔
3. اس امر پر روشنی ڈالیے کہ یہ خطوط آخر کار کیوں صدیق مکرم تک تحریری شکل میں نہیں پہنچائے جا سکے۔
4. نصاب میں شامل خطوط کی روشنی میں مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کی سرگرمیوں کا نقشہ کھینچیے۔
5. تینوں خطوط کی الگ الگ تلخیص تیار کیجیے۔

• عربی اشعار کا ترجمہ

لَقَد لامَني عِندَ القُبُورِ عَلَى البُكَا — اس نے قبروں پر میرے رونے پر میری ملامت کی ہے۔
رَفِيقِي لِتَذرَافِ الدُّمُوعِ السَّوافِكِ — میرے دوست نے بہنے والے آنسوؤں کے بہانے کے لیے
فَقالَ اَتَبكِي كُلَّ قَبرٍ رَأَيتَهُ — تو اس نے کہا: کیا تو ہر قبر جسے تو دیکھتا ہے اس پر روتا ہے
لِقَبرٍ ثَوَى بَينَ النَّوَى وَالدَّكادِكِ — ایک ایسی قبر کے لیے جو النوی اور الدکادک (دو جگہوں کے نام) کے درمیان چھپی ہوئی ہے
فَقُلتُ لَهُ اِنَّ الشَّجَا يَبعَثُ الشَّجا — میں نے اس سے کہا: یقیناً غم غم کو ابھارتا ہے
فَدَعني فَهٰذا كُلُّهُ قَبرُ مالِكِ — تو تو مجھے چھوڑ، یہ سب مالک ہی کی قبریں ہیں

• فارسی اشعار کا ترجمہ

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما — اگر تو نے دل کا تڑپنا نہیں دیکھا ہوتا (تب) ہمارا نالہ سننے کے لائق ہوتا۔
مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — اے غالب ہم اس مرتبے کے لیے راضی نہیں تھے۔
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما — شعر نے خود اس بات کی تمنا کی کہ (وہ) ہمارا فن بن جائے۔
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است — سینکڑوں بیاباں گزر گئے اور دوسرا (مرحلہ) سامنے ہے۔

آیئے، کچھ کریں

1. مولانا آزاد کی حیات اور خدمات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک چارٹ تیار کیجیے۔
2. مولانا آزاد کے مشہور اخباروں کے چند مضامین جمع کر کے ان کا خلاصہ تیار کیجیے اور ان کا صحافیانہ مقام متعین کیجیے۔
3. مولانا آزاد کی کتابوں کو اپنی لائبریری میں تلاش کیجیے۔
4. مولانا آزاد بہ حیثیت وزیرِ تعلیم ایک تقریر تیار کیجیے جس کے لیے لائبریری میں موجود کتابوں اور اپنے اساتذہ سے مدد لیجیے۔
5. مولانا آزاد کے نام ایک مکتوب لکھیے جس میں غبارِ خاطر کے خطوط پڑھنے کے بعد آپ پر کیسا اثر ہوا، اس کی تفصیل شامل ہو۔

حصۂ شاعری

نظم [113-145]

- گفتگو — علی سردار جعفری — 116
- میرا سفر — علی سردار جعفری — 120
- کھیتی — عمیق حنفی — 124
- برقِ کلیسا (ظریفانہ نظم) — اکبر الہ آبادی — 128
- متشاعر (ظریفانہ نظم) — ظفر کمالی — 133
- ہم نہیں جانتے (ترجمہ) — یوجیو مونتالے — 142

غزل [146-164]

- دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں — اسد اللہ خاں غالب — 148
- سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں — اسد اللہ خاں غالب — 148
- ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا — یگانہ چنگیزی — 153
- مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا — یگانہ چنگیزی — 153
- اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا — خلیل الرحمان اعظمی — 160
- ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا — خلیل الرحمان اعظمی — 160

قطعۂ تاریخ [165-175]

- غمِ ارشد — عطا کاکوی — 167
- دو تاریخیں — واحد نظیر — 170

مرثیہ [176-184]

- یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر — میر انیس — 178

نظم

سرسیّد تحریک کے زیرِ اثر مغرب کی تیز ہواؤں کا جو شور اٹھا، اسی میں نظمِ جدید کی داغ بیل پڑی۔ ایک خیال کو سلسلے سے آگے بڑھانا اور ارتقا کے بعد وہ انجام تک پہنچے، مغرب میں نظم کے لیے یہی طریقہ رہا ہے۔ محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب نے 1865 میں جس 'انجمنِ پنجاب' کو Useful Knowledge کی توسیع کے لیے قائم کیا، اس میں محمد حسین آزاد کی نظامت کے دوران جان پڑ گئی۔ 1867 میں انھوں نے تعلیم اور شعر و ادب کے موضوعات پر 23 لکچر دیے۔ خاص طور سے 5 اگست 1867 اور 19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جو خطبات دیے، وہ اردو کی جدید نظم کی تاریخ میں آئین کے طور پر مسلّم ہیں۔ یہیں سے نظمِ جدید کا سلسلہ شروع ہوا اور چراغ سے چراغ جلتے گئے۔

'انجمنِ پنجاب' سے ماقبل سرمائے کا جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ جیسی نظمیں حالی اور آزاد نے پیش کیں، ویسی تخلیقات اردو میں پہلے سے موجود تھیں جنھیں نظم کی تاریخ کا حصّہ نہیں ماننا کوتاہ نظری اور بے انصافی ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ نے جو موضوعاتی نظمیں کہیں، انھیں آخر نظم کی تاریخ سے کیوں ہٹایا جائے۔ فائز کے دیوان میں میلا، پنگھٹ اور تہواروں کے ساتھ قدرتی مناظر پر جو نظمیں موجود ہیں، انھیں اردو نظم کی تاریخ میں اَلقط نہیں کیا جا سکتا۔ نظیر اکبر آبادی نے واقعتاً نظم کے موضوعاتی اور ہیئتی امکانات تلاش کیے۔ کوئی دوسرا ایسا نظم نگار سامنے نہیں آ سکا جس کے پاس کائنات اور زندگی کا اتنا گہرا اور وسیع تناظر موجود ہو۔ عوامی رجحان اور تہذیب و ثقافت کی نیرنگیوں کو اپنی نظم گوئی کا حصّہ بنا کر نظیر نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نہیں ملتی۔

19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کے موضوع پر جو لکچر دیا، اسی کے ساتھ اپنی ایک نظم 'شبِ قدر' بھی پیش کی۔ عام طور پر اسی تخلیق کو اردو کی پہلی جدید نظم قرار دیا جاتا ہے۔ 30 مئی کے مناظمے میں حالی کی 'برکھا رُت' اور آزاد کی نظم 'ابرِ کرم' سامنے آئیں۔ آیندہ مناظموں میں حالی، محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے لگاتار نظمیں پیش کیں۔ اسی سے ان کے دیگر ہم عصروں میں نظم گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر اور اکبر الٰہ آبادی نے اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے نظم گوئی کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی میں اقبال، چکبست اور نظم طباطبائی نے نظم گوئی کی طرف پوری توجہ کی۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد اقبال اردو نظم کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اقبال نے بھی ہیئت اور موضوع دونوں کی سطح پر بہت واضح تبدیلیاں کیں۔ اقبال کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ نظموں کے ذریعہ عالمانہ موضوعات کو آزمانے کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ مابعد عہدِ اقبال کی تاریخ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی مرہونِ منّت ہے۔ اقبال کے زمانے میں ہی جوش ملیح آبادی نے قومی تحریک سے ترغیب پا کر ملک کے سماجی اور سیاسی مسئلوں پر نظم گوئی کی ابتدا کر دی تھی۔ جوش کے ہم عصروں میں فراق نے مختصر تعداد میں نظمیں کہیں۔ غزل زدہ ماحول میں اختر شیرانی نے رومانی نظموں کی طرف

توجہ کی۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ جہاں شعروادب کی بنیادی زمین میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں ا
نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ اسی زمانے میں آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کی سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ نظمیں بھی مقبول ہونے لگیں۔ فیض احمد
مخدوم محی الدین، مجاز، علی سردار جعفری، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، وامق جون پوری، سکندر علی وجد ایسے شعرا ہیں جنھوں
ترقی پسند نظم گوئی کو بلندی عطا کی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم شعرا میں ن۔م۔راشد، میراجی، قیوم نظر اور مجید امجد کی شاعری اردو نظم
بہترین دور سے عبارت ہے۔ خاص طور پر راشد، میراجی اور اختر الایمان اردو جدید نظم کے ایسے مثلث ہیں جن کے شاعرانہ کمالات پر غور کیے
آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

جدیدیوں کے زمانے میں نثری نظم کو علاحدہ صنف کی حیثیت سے جگہ ملی۔ وزیر آغا، شہریار، افتخار عارف، محمد علوی، ندا
قاضی سلیم، باقر مہدی کو نظم نگار کی حیثیت سے اس عہد میں شناخت حاصل ہوئی۔ شاعرات کا ایک بڑا قافلہ بھی جدیدیت کے زمانے
سامنے آیا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ یہ ایک
ہے کہ موجودہ دور میں دانش ورانہ فکر کے اظہار کے لیے نظم سے بہتر شاعری میں کوئی دوسری صنف موجود نہیں۔

علی سردار جعفری

29 نومبر 1913 کو علی سردار جعفری، بلرام پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ کے تعلیمی اداروں میں انھوں نے تعلیم مکمل کی۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی معماروں میں انھیں شمار کیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد جب سجاد ظہیر پاکستان چلے گئے تب انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ بعد میں وہ اس کے ترجمان 'نیا ادب' کے مدیر بھی ہوئے۔ کافی عرصہ بعد انھوں نے 'گفتگو' نام سے ایک رسالہ نکالا جس کا ضخیم ترقی پسند ادبی نمبر بہت مشہور ہوا۔

سردار جعفری نے اپنی ادبی زندگی افسانہ نگاری سے شروع کی۔ 1938 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' شائع ہوا۔ پھر وہ شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پرواز، (1943)، خون کی لکیر (1949)، پتھر کی دیوار (1953)، ایک خواب اور (1964)، پیراہن (1965)، اور لہو پکارتا ہے (1978) ان کے اہم شعری مجموعے ہیں۔ ایشیا جاگ اٹھا (1951) اور نئی دنیا کو سلام (1964) ان کی طویل نظمیں ہیں جن سے سردار جعفری کے تجرباتی ذہن کا پتا چلتا ہے۔ شاعری میں جعفری نے پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں کہیں۔ لیکن آزاد نظم کا سانچہ انھیں زیادہ مرغوب ہے اور اس ہیئت میں انھوں نے بہترین شاعری کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔

سردار جعفری لگاتار تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں 'ترقی پسند ادب' (1953) کے عنوان سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ بعد میں یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ 'لکھنؤ کی پانچ راتیں (1965)، 'اقبال شناسی'، 'پیغمبرانِ سخن') ان کی مشہور تنقیدی کتابیں ہیں۔ غالب، کبیر اور میر کے کلام کی اردو اور ہندی میں الگ الگ جلدوں میں اشاعت کی اور ان کے فن کے تعلق سے بھرپور مقدمے بھی لکھے۔ میر انیس پر بھی سردار جعفری کا مضمون اہمیت کا حامل ہے۔

سردار جعفری ہندستان اور ایشیا میں ترقی پسند ادیبوں کے نمایندہ کے طور پر شناخت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت ترقی پسندوں میں باقیات الصالحات کی تھی۔ یکم اگست 2000 کو ان کا انتقال ہوا۔ انھیں 'پدم شری' (1967)، بھارتیہ گیان پیٹھ (1997) اور اقبال سمان جیسے اہم ایوارڈس بھی حاصل ہوئے۔

علی سردار جعفری

گفتگو

(ہندو پاک دوستی کے نام)

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

ہم جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دُشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خم دار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بہ صد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اُٹھ جائے گی، مہمان مروّت ہوگی

ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگ زاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اُتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

لفظ و معنی

دشنام - گالی
خم دار - ٹیڑھا، ترچھا، جھکا ہوا
نوا - آواز
زنجیر بہ پا کرنا - پانو میں زنجیر پہنانا
لغزش - لڑکھڑاہٹ
سوغات - تحفہ
ریگ زار - ریگستان

آپ نے پڑھا

- نظم 'گفتگو' سردار جعفری کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کو انھوں نے ہندو پاک دوستی کے نام سے منسوب کیا ہے۔ نظم میں انھوں نے ملک کے درمیان پیدا ہونے والے مسئلوں سے نجات کی ترکیب بتائی ہے۔
- ہندو پاک ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان ہمیشہ کشیدگی برقرار رہتی ہے۔ آزادی سے پہلے دونوں ممالک حکومت برطانیہ کے غلام تھے۔ سبھوں نے ساتھ مل کر ہی آزادی کی جنگ لڑی اور آزادی پائی، مگر آزادی کے بعد ملک کی تقسیم ہوئی اور دونوں ممالک ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔
- شاعر ان سب باتوں سے واقف ہے۔ اس لیے وہ اس مسئلے کا حل 'گفتگو' کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ گفتگو ایک ایسی چیز ہے جس

سے بڑے سے بڑا مسئلہ بہ آسانی حل ہو جاتا ہے۔ شاعر کو بھی ان دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کا حل گفتگو کے ذریعے نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان ایک ایسی ملاقات ہو جو اس وقت تک ختم نہ ہو جب تک کہ ان کے درمیان کے مسئلے اور دشمنی ختم نہ ہو جائیں۔

- کل تک دونوں ممالک ایک دوسرے کے اوپر سنگ اٹھائے ہوئے تھے، ایک دوسرے پر طنز کرتے تھے، زہر کے جام گھولا کرتے تھے، ایک دوسرے کو ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے لیکن آج اس گفتگو میں ضرورت ہے تو ان سب باتوں کو بھلا دینے کی۔ کل جو ہاتھ پتھر لے کر مارنے کے لیے اٹھتے تھے، ان ہاتھوں سے دوستی کا دامن تھام لینا بہتر ہے۔ ایک دوسرے کے شکوے شکایت بھول کر آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور محبت کے جام چھلکائیں۔ ایسا کرنے سے ہی ان دونوں ملکوں کا مستقبل روشن ہو پائے گا۔ دو ملک میں بسنے والوں کے نام اس نظم کا یہی پیغام ہے۔

آپ بتائیے

1. 'گفتگو' نظم کس شاعر کی لکھی ہوئی ہے؟
2. 'گفتگو' نظم کو شاعر نے کس کے نام کیا ہے؟
3. شامِ ملاقات کب تک چلے گی؟
4. الفاظ کے ہاتھوں میں کیا ہے؟
5. 'طنز' کیسا جام چھلکاتا ہے؟
6. 'ترش ابروے خم دار' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
7. کس کے چٹکنے کی صدا آتی ہے؟
8. کس تحفہ اور سوغات کی بات اس نظم میں آئی ہے؟
9. تاروں بھری رات کس طرح چلتی ہے؟

مختصر گفتگو

1. درج ذیل اقتباس کو پڑھیے اور ان کی روشنی میں پوچھے گئے سوالوں کے جواب دیجیے:

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بہ صد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

(i) 'حرفِ وفا' سے آپ کیا سمجھتے ہیں اور یہ کب اور کس طرح آئے گا؟

(ii) عشق کس طرح آئے گا؟ لغزش پا کے کیا معنی ہیں؟

2. نظم 'گفتگو' کا مختصر خلاصہ لکھیں۔

3. ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگ زاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے
اس اقتباس کی تشریح اپنی زبان میں کریں۔

تفصیلی گفتگو

1. نظم 'گفتگو' میں شاعر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟

2. نظم 'گفتگو' کی شاعرانہ خوبیوں کو واضح کیجیے۔

3. سردار جعفری کی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔

● ذرا غور کریں

نظم شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ نظم کسی ایک موضوع کو مرکز بنا کر تخلیق کی جاتی ہے۔ غزل میں ہر شعر موضوع اور خیال کے اعتبار سے علاحدہ ہوتا ہے۔ لیکن نظم میں کسی ایک خیال کو ہی مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ نظم کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ پابند نظم ۲۔ معریٰ نظم ۳۔ آزاد نظم ۴۔ نثری نظم

نظم کو اس کی بناوٹ کے لحاظ سے قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ اس بناوٹ کو ادب کی زبان میں ہیئت کہتے ہیں۔ آپ نے جو نظم پڑھی، وہ ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم ہے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اس تحریک کے لیے ان کی تنظیمی سرگرمیاں کیا تھیں؟ ان کے متعلق معلومات حاصل کیجیے۔

2. ہندستان اور پاکستان کے مابین جذبۂ خیر سگالی کے فروغ کے لیے کی گئی شاعری کے نمونے جمع کیجیے۔

نظم

میرا سفر

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سر سبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی

دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے
میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

لفظ و معنی

برگ - پتا
نطق - گویائی، بولنے کی طاقت
راگنی - راگ کا ہر شعبہ (کُل چھتیس راگنیاں ہیں)
حنا - مہندی
عروس - دلہن
فصلِ خزاں - پت جھڑ کا موسم
رہرو - راستہ چلنے والا، مسافر
گریزاں - بھاگتا ہوا، بھاگنے والا
افسوں - جادو

آپ نے پڑھا

- موت ہر جاندار پر لازمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پیدائش کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ شاعر نے موت کے سفر کی معنویت کو اس نظم میں پیش کیا ہے۔ اس نے پہلے ہی مصرعے میں کہا ہے کہ ''پھر اک دن ایسا آئے گا۔''
- موت سے پہلے آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے، زبان سے اس کی گویائی چھن جاتی ہے۔ اب تک زندگی میں انسان جو بھی خوش گوار لمحے گزار چکا ہے، موت سے پہلے وہ ساری شکلیں مسخ ہو جاتی ہیں، محفلیں ویران نظر آنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ خون کی رفتار اور دل کی دھڑکن بھی تھم جاتی ہے۔ زندگی میں یہی موت کی علامت ہے۔ شاعر نے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے انسانی اعضا کے ان استعاروں کا استعمال کیا ہے۔ آنکھوں کے دیے، ہاتھوں کے کنول، زبان کے پتے سے نطق و صدا کی تتلی۔ اس طرح اس نے وقت اور اپنی ذات کے استعاروں سے نظم کو ایک شاعرانہ حسن عطا کیا ہے۔
- شاعر کہتا ہے کہ موت کے بعد لوگ مجھے اس وقت یاد کریں گے جب میں کچھ اچھا کام کروں گا، میری اچھائی ہی مجھے مرنے کے بعد زندہ رکھے گی۔

آپ بتایئے

1. 'میرا سفر' نظم کی ہیئت کیا ہے؟
2. علی سردار جعفری کی پیدائش کہاں ہوئی؟
3. علی سردار جعفری کی چار نظموں کے نام بتایئے۔
4. علی سردار جعفری کی وفات کب ہوئی؟

5. انھیں گیان پیٹھ کا ایوارڈ کب ملا؟
6. علی سردار جعفری کا تعلق کس تحریک سے رہا؟
7. علی سردار جعفری کی دو تنقیدی کتابوں کے نام بتائیے۔
8. کس فارسی شاعر سے متاثر ہو کر 'میرا سفر' نظم لکھی گئی ہے؟
9. کیا شاعر نے خود کو ایک تڑپتا قطرہ قرار دیا ہے؟

مختصر گفتگو

1. آنکھوں کے دیے کب بجھ جاتے ہیں؟
2. شاعر نے 'تڑپتے قطرے' کی کیا خوبی بیان کی ہے؟
3. موت کی آمد سے پہلے جو منظر پیش کیا گیا ہے، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
4. موت کے بعد شاعر کس طرح امر ہو جائے گا؟
5. زبان کے پتے سے آواز کی تتلی اڑ جائے گی۔ یہ بتا کر شاعر کس حقیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. علی سردار جعفری کی نظم نگاری کی خصوصیات واضح کیجیے۔
2. 'میرا سفر' نظم میں منظر نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. علی سردار جعفری کی تصانیف کی فہرست تیار کیجیے۔
2. اپنے استاد کی مدد سے سردار جعفری کی نصیحت آمیز نظمیں منتخب کیجیے۔ انھیں یاد کیجیے اور اپنے اسکول کی کسی تقریب میں سنایئے۔

عمیق حنفی

عمیق حنفی کا اصل نام عبدالعزیز حنفی تھا۔ 1928 میں وہ مدھیہ پردیش کے ضلع اندور کے میوچھاونی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ اور سیاسیات کے مضامین میں انھوں نے ایم۔اے۔کیا۔ فلسفہ، موسیقی اور ادبیات پر ان کی یکساں نگاہ تھی۔ آل انڈیا ریڈیو میں انھوں نے طویل مدت تک ملازمت کی، جہاں سے اسٹیشن ڈائرکٹر کی حیثیت سے وہ سبک دوش ہوئے۔ 1988 میں دہلی میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'سنگِ پیراہن' ہے۔ جس پر ترقی پسند تحریک کے واضح اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ بعد میں وہ جدیدیت کے اثرات میں آئے۔ متعدد شعری تجربے ان سے یادگار ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر طویل نظموں کا سلسلہ قائم کیا جن میں 'سند باد'، 'شہرزادہ'، 'سیارگاں'، 'شب گشت'، 'صورت الناقوس' اور 'صلصلۃ الجرس' کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے جن سے جدید ادب کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ 'شعلے کی شناخت' اور 'شعر چیزے دیگر است' ان کی ایسی تنقیدی کتابیں ہیں جنھیں صرف سرسری پڑھ کر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ موسیقی کی انھوں نے باضابطہ تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی جس کی وجہ سے استاد رجب علی خان پر مبسوط کتاب لکھنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ انھیں جدیدیت سے وابستہ معتبر شعرا کی صف میں شامل تسلیم کیا جاتا ہے۔

عمیق حنفی

کھیتی

وقت کی کھیتی ہم
وقت بوتا ہے، اُگاتا، پالتا ہے
اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت
سبز کو زرّیں بنانے کی اجازت مرحمت کرتا ہے اور
ناچنے دیتا ہے بادِ شوخ کی موجوں کے ساتھ
جھومنے دیتا ہے سورج کی کرن کی ہم دَمی میں
چاندنی پی کر ہمیں بدمست ہوتا، پا کے خوش ہوتا ہے وقت
ہاں مگر انجام کار
کاٹ لیتا ہے ہمیں
ہم بالآخر اُس کے لقمے!
ہم بالآخر اُس کی فصل!

لفظ و معنی

زرّیں – سنہرا
مرحمت – عنایت، مہربانی
باد – ہوا
ہم دمی – دوستی
بدمست – مدہوش، نشے میں چور
انجام کار – آخرکار

کہکشاں : حصہ دوم

آپ نے پڑھا

- ابھی تک آپ ابتدا، ارتقا اور انجام کی روحانی توجیہات سے واقف ہوتے رہے ہیں۔ یہاں نظم 'کھیتی' میں زیِ حیات کی مادّی توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ اسے آپ طویل عہد پر احاطہ کیا ہوا تجربہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ نظم کا ایک حصہ بننے اور بڑھنے سے جڑا ہے تو دوسرا لازمی انجام سے۔ آپ اس نظم کو بڑی آسانی سے کھیتی باڑی کا قصہ سمجھ سکتے ہیں لیکن پہلے ہی مصرعے 'وقت کی کھیتی ہم' میں آیا لفظ 'ہم' اوپر درج جملے سے ہماری توجہ ہٹا دیتا ہے۔ زندگی یہاں نئی شبیہ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آخر کے دو مصرعے۔

ہم بالآخر اس کے لقمے
ہم بالآخر اس کی فصل

یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ہماری قوّت و حیثیت، روز و شب، محبت و نفرت وغیرہ وقت کے لقمے ہیں اور یہی 'وقت' ہماری حد ہے۔

- نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ وقت ہمیں مواقع دیتا ہے اور پھر خوش ہوتا ہے۔ دراصل وقت اس نظم کا مرکزی کردار ہے، اس کے ہاتھوں ہی انسان کے مقدر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ایک ایسے فیصلے کا جس کا نتیجہ ہمیشہ فنا ہی ہوتا ہے۔
- شاعر نے نظم میں وقت کے کردار میں ربانیت اور قہاریت کی شکلوں کو اُبھارا ہے۔ ایک طرف تو یہ انسانوں کو ایک خاص مرحلے تک پروان چڑھاتا ہے اور دوسری طرف وہ انھیں فنا کے حوالے کر دیتا ہے۔ تمام انسان اس کی کھیتی ہیں۔ فصل تیار ہو جائے تو معمول کے مطابق انسانوں کو وقت کا لقمہ بننا ہی پڑتا ہے۔ وقت کا پورا عمل دراصل اس کے خود اپنے وجود کی بقا کے لیے ہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس نظم سے ظاہر ہو گئی ہے۔
- گیارہ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم انسان کی بقا اور اس کی فنا کے مرحلوں کے ساتھ ہی وقت کی قوّت سے ہمیں بڑے پُر اثر انداز میں آشنا کراتی ہے۔
- یہ ایک آزاد نظم ہے۔ اس کے مصرعوں میں ارکان برابر ہوں، یہ ضروری نہیں لیکن پوری نظم ایک بحر میں کہی جاتی ہے۔

آپ بتائیے

1. کیا 'کھیتی' ایک پابند نظم ہے؟
2. کھیتی کی ہیئت کیا ہے؟
3. اس نظم کے شاعر کون ہیں؟
4. 'اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت'۔ کیا یہ مصرع نظم 'کھیتی' سے ماخوذ ہے؟
5. سبز کونپلیں بنانے کی اجازت ہمیں کون مرحمت کرتا ہے؟
6. سورج کی کرن کی ہم دمی میں کیا وقت ہمیں جھومنے دیتا ہے؟

7. کیا تمام انسان وقت کی کھیتی ہیں؟
8. کیا تمام انسان وقت کے لقمے ہیں؟
9. کیا وقت نظم 'کھیتی' کا مرکزی کردار ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. ہم وقت کی کھیتی کس طرح ہیں؟ نظم 'کھیتی' کے حوالے سے جواب دیں۔
2. وقت انسانوں کو کیا مواقع دیتا ہے؟ اس نظم کی روشنی میں واضح کیجیے۔
3. وقت کیوں خوش ہوتا ہے؟
4. کیا نظم 'کھیتی' ایک پُر اثر نظم ہے؟

● ہاں مگر انجام کار
کاٹ لیتا ہے ہمیں
ہم بالآخر اس کے لقمے!
ہم بالآخر اس کی فصل!

درج بالا اقتباس کی تشریح کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. استاد کی مدد سے ایسی نظموں کا مطالعہ کیجیے جن میں وقت کے طاقت ور ہونے کا بیان ہو۔
2. آپ نے اب تک جن آزاد نظموں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی فہرست تیار کیجیے اور اسے اپنے استاد کو دکھایئے۔
3. آزاد نظم، پابند نظم اور معریٰ نظم کے فرق کو بتانے کے لیے ایک چارٹ پیپر تیار کیجیے۔

اکبر الہ آبادی

اکبر جن کا پورا نام اکبر حسین تھا، اکتوبر 1845 میں بہ مقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے ان کا سنہ پیدایش 1846 لکھا ہے جو درست نہیں۔ سیّد فضل محمد ان کے دادا اور تفضّل حسین ان کے والد تھے۔ اکبر کے خاندان کے افراد دنیوی شان و شکوہ کے حامل تھے۔ ان کے بزرگوں کو تحصیلِ علم کا بھی شوق تھا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزوں سے زیادہ تعصّب بھی نہیں تھا۔

اکبر کا بچپن داؤدنگر اور سورام وغیرہ میں گزرا۔ 1856 میں جب اکبر کی عمر گیارہ برس تھی، ان کے والدین الہ آباد میں آباد ہو گئے۔ یہاں اکبر کا داخلہ ایک مشن اسکول میں ہوا۔ اس سے پہلے وہ گھر پر اردو، فارسی، انگریزی، عربی اور ریاضی کی ابتدائی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ مشن اسکول میں داخلہ لیے ابھی ایک برس ہی ہوا تھا کہ غدر کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ غدر کے بعد اکبر کے خاندان کی مالی حالت اچھی نہیں رہی، اس لیے اکبر اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور ملازمت کرنے لگے۔

اکبر نے ابتدا میں کئی عارضی ملازمتیں کیں۔ مثلاً عرضی نویسی، سررشتہ داری، نائب تحصیل داری، مسل خوانی وغیرہ۔ بعد میں انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور وکیل ہوئے۔ وہ منصف اور سب جج بھی رہے۔ الہ آباد میں عدالت کی منصفی سے دسمبر 1903 میں ریٹائر ہوئے۔ ان کی عدالتی خدمات کے عوض 1898 میں انھیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اکبر کی زندگی پریشانیوں میں بسر ہوئی۔ وہ متعدد امراض کے شکار ہو گئے۔ اکتوبر 1910 میں ان کی بیوی کا وصال ہوا۔ 1913 میں ان کا لڑکا ہاشم جسے وہ بے حد عزیز رکھتے تھے، تیرہ برس کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ ان صدموں سے اکبر نڈھال ہو گئے۔ ان میں جینے کی امنگ باقی نہیں رہی۔ 9 ستمبر 1921 کو انھوں نے الہ آباد میں وفات پائی۔

اکبر 'اودھ پنچ' کے نورتنوں میں تھے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ ظریفانہ مضامین بھی لکھے۔ اردو ادب میں وہ اپنی ظریفانہ شاعری کے سبب مشہور ہوئے۔ ایک ضخیم کلیات ان سے یادگار ہے جس میں ان کے چار دواوین شامل ہیں۔

برقِ کلیسا

رات اس مِس سے کلیسا میں ہوائیں دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دِل کش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسّم سے گرانے والی

پہلوے حسنِ بیاں شوخیِ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یاحفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہوجائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہوجائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
نازوانداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیرممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں، توپ سے لڑ جاتے ہیں

گُل کھلائے کوئی میداں میں تو اِترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذّتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دِلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

لفظ و معنی

کلیسا - گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ
دوچار ہونا - ملاقات ہونا، سامنا ہونا
زلفِ پیچاں - بل کھائی ہوئی زلف
رعنا - حسین، نازک، نرم
درخشاں - چمکتا ہوا، تاباں
مَلَک - فرشتہ
فتنہ - فساد، شوخ
جھپک جانا - شرمانا
تقویٰ - خدا کا خوف، پارسائی
برق - بجلی
سُر - علم موسیقی کی اصطلاح، آواز کے سات درجوں میں سے ایک درجہ
تمکین - مرتبہ، عزت

گت ۔ نغمہ، سُر

سکت ۔ طاقت، قوت

سیری ۔ آسودگی، اطمینان

تیوری ۔ نظر، نگاہ، پیشانی

تیوری چڑھانا ۔ غصہ ہونا

اُنس ۔ محبت

لن ترانی کی لینا ۔ ڈینگ مارنا

مہدی ۔ پیشوا، مسلمانوں کے بارھویں امام جن کا ظہور قربِ قیامت ہوگا

گل کھلانا ۔ فساد کھڑا کرنا، کوئی انوکھا کام کرنا

اقامت ۔ قرار

نیک نہاد ۔ نیک نفس

ہنوز ۔ ابھی تک

رف رف ۔ وہ جانور جس پر پیغمبرؐ شبِ معراج (براق کے بعد) آسمانوں پر پہنچنے کے بعد سوار ہوئے تھے

سپاہ ۔ فوج، لشکر

جوہر ۔ خاصیت، خوبی

رو ۔ چہرہ

خاطر ۔ دل

دودلا ۔ شکی، وہمی، متذبذب

پیرِ مغاں ۔ شراب بیچنے والا

عتاب ۔ ملامت، غصہ

صاحبِ فہم ۔ سمجھ دار

آپ نے پڑھا

- اکبر الہ آبادی اردو کے نمایندہ نظم گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ 'برقِ کلیسا' ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔
- اکبر الہ آبادی کی زیادہ تر نظموں میں انگریزی تہذیب و تمدن کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ اس نظم میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔

- اس نظم کے ابتدائی چند اشعار میں بہت ہی دل کش انداز سے ایک انگریز میم کے حسن کی تعریف کی گئی ہے لیکن اس تعریف میں طنز کا نشتر کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
- اس نظم میں شاعر نے مسلمانوں کی بدحالی اور بے راہ روی کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر نے مسلمان بزرگ پیغمبر و صحابہ کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔
- اس نظم کے ذریعے وہ مسلمانوں کے دلوں میں نئی روشنی بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسے مسلمانوں کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں جو انگریزی تہذیب کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔
- اس نظم میں ایک چھوٹی سی داستانِ عشق بھی پیش کی گئی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج کے لوگ عارضی محبت اور محبوب کے لیے اپنے دین و مذہب کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔
- اس نظم کے ذریعہ اکبر الہ آبادی اصلاحِ قوم کا کام لیتے ہیں۔

آپ بتائیے

1. اکبر الہ آبادی کس طرح کے شاعر تھے؟
2. اکبر کس پرچے کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے؟
3. نظم 'برقِ کلیسا' کے خالق کا نام بتائیے۔
4. شاعر کو مِس کہاں ملی؟
5. شاعر نے اس نظم میں 'گلشنِ فطرت کی بہار' کسے کہا ہے؟
6. دولت و عزت و ایمان کس کے قدموں پہ شاعر نثار کرنا چاہتا ہے؟
7. 'حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر'۔ یہ بات شاعر نے کس کے بارے میں کہی ہے؟
8. 'اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح'۔ یہ بات اس نظم میں کس نے کس سے کہی ہے؟

مختصر گفتگو

1. اکبر الہ آبادی نے اپنی نظم کا عنوان 'برقِ کلیسا' کیوں رکھا؟
2. مِس نے مسلمانوں کے بارے میں اس نظم میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟
3. اس نظم میں شاعر نے مِس کے روبہ رو مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟
4. شاعر کی کس بات پر مِس ہنس کر نہیں بولتی ہے؟ اس موقعے پر وہ شاعر سے کیا کہتی ہے؟
5. نظم 'برقِ کلیسا' کے ذریعہ شاعر ہمیں کیا بتانا چاہتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. نظم 'برقِ کلیسا' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔
2. اکبرالہ آبادی کی شاعری کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟ بتایئے۔
3. نظم 'برقِ کلیسا' کی شاعرانہ خوبیاں واضح کیجیے۔

- مصرعوں کو درست کیجیے

1. رات اس مس سے گرجا میں ہوا میں دوچار
2. تو اگر عہدِ وفا کھول کے میری ہو جائے
3. حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں حاجی بن کر
4. سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں الحمداللہ
5. میرے اسلام کو ایک قصۂ مستقبل سمجھو

- اس نظم سے کم از کم پانچ تراکیب چن کر لکھیے۔
- اس نظم سے پانچ مشدّد الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔
- نیچے دیے گئے الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی جنسیت ظاہر ہو جائے۔

زلف، تقریر، بلبل، شجر، قصہ، گیسو، جوہر، عزّت، سرحد، نزاکت، اُنس

آیئے، کچھ کریں

1. کتب خانے کی مدد سے اکبرالہ آبادی کی دو مشہور نظمیں تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیے۔
2. اکبرالہ آبادی کے عہد کے شاعروں کی فہرست بنایئے۔

متشاعر

اگر شعر کہتا نہیں مَیں تو کیا ہے　　مرے نام نامی کا شہرہ بڑا ہے
عنایت ہے لوگوں کی، جوٗد و عطا ہے　　یہ اردو کا صدقہ ہے، فضلِ خدا ہے
نہیں تیل گرچہ چراغِ سخن میں
بُلاوا ہے پھر بھی ہر اک انجمن میں

سُنانے غزل شہر در شہر جاؤں　　کروں بن کے بلّی میاؤں میاؤں
جہاں جاؤں لوگوں کو مکھّن لگاؤں　　کسی کو کِھلاؤں کسی کو پلاؤں
رواں چاپلوسی کا مجھ سے ہے دریا
اسی بل پہ جاتا ہوں دھنباد، جھریا

اثر کچھ نرالا ہے میرے بَٹر میں　　یہی مجھ کو رکھتا ہے شعری سفر میں
کبھی اِس نگر میں، کبھی اُس نگر میں　　کناڈا میں، پیرس میں، دوحہ قطر میں
کبھی جی حضوری سے تھکتا نہیں ہوں
غرض کی ڈگر سے بہکتا نہیں ہوں

کسی دَر پہ دن رات دھونی رمائی　　کسی دَر پہ دی ہے شکم کی دہائی
کہیں دُم ہلائی کہیں دُم دبائی　　کیا ذبح غیرت کو بن کر قصائی
سخن ور نہیں ہوں سخن ور بنا ہوں
جہانِ ادب کا سکندر بنا ہوں

جو تضمین لکھ دے، وہ ہے یار میرا　　جو پیروڈیاں دے، وہ غم خوار میرا
نوازے جو نظموں سے، معمار میرا　　جو دیوان دے دے، وہ سردار میرا
چلے بس تو واہی کی پونجی اُڑالوں
میں دیوانِ اکبر پہ قبضہ جمالوں

نہ تھا شاعری کا کبھی مجھ کو یارا　　جہالت نے لیکن بہت زور مارا
زمانے نے دیکھا ہے یہ بھی نظارا　　فضاؤں میں اُڑتا ہے پچکا غبارا
ملی ہے مجھے دولتِ بے ضمیری
فقیری میں کرنے لگا ہوں امیری

گلی در گلی خاک یوں پھانکتا ہوں　　کہ ہر روز ستّر کنویں جھانکتا ہوں
میں کیا ہوں یہ اچھی طرح آنکتا ہوں　　بڑا تو نہیں ہوں مگر ہانکتا ہوں
غلط فہمیوں کا عجب رنگ گھولا
ممولے نے بدلا ہے شاہیں کا چولا

ہو پٹنہ کہ دلّی، دکن ہو کہ پُونا　　نہ جاؤں اگر مَیں تو جلسہ ہو سُونا
جو افسر ہیں ان سے کماتا ہوں دُونا　　ہمیشہ لگاتا ہوں اردو کو چُونا
اُسے پیتا ہوں اُسے کُوٹتا ہوں
لٹیرا ہوں اردو کو میں لُوٹتا ہوں

جو شاعر ہیں اصلی وہ گھستے ہیں چندن　　مقدّر میں ان کے شکاگو نہ لندن
اگرچہ ہے نقلی مرے فن کا جوبن　　اسی سے ہوا گلف میں نام روشن
خوشامد کی میں دال تھا گل گیا ہوں
کہ سکّہ ہوں کھوٹا مگر چل گیا ہوں

جو گرگٹ کا ہوتا ہے وہ رنگ ہوں میں　　نہ ہولاج جس میں وہی اَنگ ہوں میں
یہ سچ ہے کہ ہاری ہوئی جنگ ہوں میں　　ادب کے لیے باعثِ ننگ ہوں میں
لگا ہے ظرافت کا چہرے پہ غازہ
نکالوں گا اردو کا میں ہی جنازہ

لفظ و معنی

متشاعر ـ جو شاعر نہ ہو مگر شاعر بنتا ہو، بناوٹی شاعر
نام نامی ـ مشہور و معروف نام

BSTBPC-2018

شہرہ - دھوم دھام، شہرت
عنایت - مہربانی، توجہ، تحفہ
جود - بخشش، سخاوت
عطا - انعام، بخشش
انجمن - مجلس، محفل
مکھن لگانا - خوشامد کرنا
رواں - جاری، بہتا ہوا، تیز
بٹر(Butter) - مکھن
جی حضوری کرنا - خوشامد کرنا، ہاں میں ہاں ملانا
دھونی رمانا - الاو جلا کر سادھوؤں کی طرح بیٹھ جانا
شکم - پیٹ
دہائی دینا - کسی کا نام لے کر فریاد کرنا
دم ہلانا - چاپلوسی کرنا
دم دبانا - بھاگنا، مغلوب ہونا
غیرت کو ذبح کرنا - نہایت بے شرم ہونا
سخن ور - شاعر، شعر کہنے والا
تضمین - اصطلاحِ شاعری میں دوسرے کے شعر پر مصرع یا بند لگانا
پیروڈی - کسی مصنف کی عبارت، نظم یا اسلوبِ بیان وغیرہ کی نقل اور تضحیک

آپ نے پڑھا

- ظریفانہ شاعری کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ ہنسنا اور رونا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ظاہر کے جو لفظ ہمیں گدگداتے ہیں، داخل میں انھیں سے ہم آنسو بہانے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ سماجی انتشار اور برائیوں کے زمانے میں ظرافت کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔
- ایک عام نظم اور ظریفانہ نظم میں بنیادی فرق اندازِ نظر اور اسلوبِ بیان کا ہوتا ہے۔ ظریفانہ نظم میں کسی خیال یا واقعہ میں پوشیدہ بے اعتدالی، ناہمواری اور اس کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے، ساتھ ہی ساتھ بیان میں الفاظ کے رائج معانی میں

آپ بتایئے

1. متشاعر کے لفظی معنی کیا ہیں؟
2. نرالا اثر متشاعر کی کس چیز میں ہے؟
3. کس کام سے متشاعر کبھی بھی نہیں تھکتا ہے؟
4. متشاعر بھلے شعر نہیں کہتا ہو لیکن وہ کس بات پر مطمئن ہے؟
5. دھنیا دار اور جھریا کس بنیاد پر متشاعر جاتا رہتا ہے؟
6. متشاعر کا یار کون ہے؟
7. متشاعر کی نظر میں غم خوار کون ہے؟
8. متشاعر کا سردار کون ہے؟
9. متشاعر کا بس چلے تو وہ کون سے کام کرنا چاہتا ہے؟
10. متشاعر کن لوگوں سے دوگنا کماتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. متشاعر اردو کا جنازہ آخر کس طرح نکالے گا؟
2. ممولے نے شاہین کا چولا بدل لیا، اس سے شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
3. اس نظم میں جن شہروں اور ملکوں کے نام آئے ہیں، انھیں ترتیب وار لکھیے۔ ملکوں کی راجدھانیاں بھی لکھیے۔
4. متشاعر خود کو کھوٹا سکہ کیوں کہہ رہا ہے؟
5. 'کیا ذبح غیرت کو بن کر قصائی' اور 'ملی ہے مجھے دولتِ بے ضمیری' کا مطلب بتایئے۔
6. ادب کے لیے خود کو 'باعثِ ننگ' متشاعر کیوں کہہ رہا ہے؟ بتایئے۔

تفصیلی گفتگو

1. نظم 'متشاعر' کے لکھنے کا مقصد کیا ہے؟
2. شعر نہیں کہنے کے باوجود کن باتوں کے سبب متشاعر کی شہرت اور اہمیت قائم ہوئی؟ بتایئے۔
3. اصلی شاعر نقلی شاعر کے مقابلے میں حالات کی ستم ظریفیوں کا کس طرح شکار ہے، واضح کیجیے۔
4. متشاعر کیا اردو کی تجارت کر رہا ہے یا زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے؟ نظم کے حوالے سے جواب دیجیے۔
5. دوسروں سے کلام حاصل کرنے کے لیے متشاعر کون کون سے کرتب کرتا ہے، اسے بتایئے۔

- خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے۔

۱۔ مقدّر میں ان کے.....نہ.....

۲۔.....کا سکندر بنا ہوں

۳۔ فضاؤں میں اڑتا ہے.....غبارا

۴۔ یہ سچ ہے کہ.....ہوئی جنگ ہوں میں

۵۔ خوشامد کی میں.....تھا،.....گیا ہوں

- مندرجہ ذیل مصرعوں کی صحیح ترتیب تیار کیجیے۔

جو افسر ہیں ان سے دونا کماتا ہوں

امیری میں کرنے لگا ہوں فقیری

غلط فہمیوں کا رنگ گھولا عجب

اڑا لوں چلے بس تو واہی کی پونجی

ستر کنویں ہر روز کہ جھانکتا ہوں

- اس نظم میں

ان مصرعوں کو پڑھیے——

سنا نے غزل شہر در شہر جاؤں

گلی در گلی خاک یوں پھانکتا ہوں

شہر در شہر یا گلی در گلی ایک ہی لفظ کے بیچ میں در شامل کر کے ترکیب کی شکل میں ابھرے ہیں۔ ان سے عام طور پر شہر شہر میں گلی گلی میں معنی مراد لیتے ہیں۔ مقصد ہر جگہ زیادہ سے زیادہ وسعت کا بیان ہے۔

آپ اپنی درسی کتاب سے ایسی ترکیبیں چنیے جن میں شروع اور آخر کے دونوں الفاظ ایک ہی ہوں۔ آپ اپنے طور پر پانچ ایسی تراکیب بھی بنائیے۔

- مندرجہ ذیل مصرعوں کو بلند آواز سے پڑھیے:

رواں چاپلوسی کا مجھ سے ہے دریا

غرض کی ڈگر سے بہکتا نہیں ہوں

ملی ہے مجھے دولتِ بے ضمیری

نکالوں گا اردو کا میں ہی جنازہ

یہ تمام مصرعے متشاعر کی زبان سے پیش کیے گئے ہیں۔ بیان میں اتنی سنجیدگی ہے کہ معمولی غفلت میں بھی طنز کی چوٹ سے ہم دور رہ جائیں گے۔ لطف یہ ہے کہ متشاعر بے ضمیری کو دولت کہتا ہے اور اسے وہ اپنی خوبی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ ظرافت کی معراج ہے کہ براہِ راست اظہار بھی موثر ذریعہ تلاش کر لینے میں کامیاب ہے۔

- ذیل کے دو شعر پڑھیے۔

نہیں تیل گرچہ چراغِ سخن میں
بلاوا ہے پھر بھی ہر اک انجمن میں

رواں چاپلوسی کا مجھ سے ہے دریا
اسی بل پہ جاتا ہوں دھنباد جھریا

مذکورہ اشعار میں چراغِ سخن میں تیل کا نہیں ہونا اور چاپلوسی کا دریا رواں ہونا ایسے استعارے ہیں جن سے ظریفانہ کیفیت میں اضافہ مقصود ہے۔ چراغِ سخن میں تیل نہیں ہونے کے باوجود ہر محفل میں بلایا جانا، متشاعر کے کسی دوسرے کھیل تماشے کی طرف اشارہ ہے۔ یوں بھی سخن کے چراغ میں تیل ہونا یا نہیں ہونا، دونوں باتوں میں مزاحیہ انداز قائم ہے۔

- مندرجہ ذیل بند ملاحظہ کیجیے۔

جو تضمین لکھ دے، وہ ہے یار میرا — جو پیروڈیاں دے، وہ غم خوار میرا
نوازے جو نظموں سے، معمار میرا — جو دیوان دے دے، وہ سردار میرا

چلے بس تو واہی کی پونجی اڑا لوں
میں دیوان اکبر پہ قبضہ جما لوں

اس بند میں تضمین، پیروڈی، نظم اور دیوان جیسی ادبی اصطلاحوں کے نام آئے ہیں۔ آپ یہاں ان کی تفصیل سے واقف ہو جایئے۔

تضمین: اپنی نظم یا غزل میں کسی دوسرے شاعر کے شعر یا مصرعے کو اس طرح استعمال میں لے آنا کہ وہ مصرع یا شعر معنوی طور پر چسپاں ہو جائے، تضمین ہے۔ طرحی غزلوں میں مصرعِ طرح پر مصرعہ چسپاں کرنا شاعر کا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ ابھی حال کے زمانے میں مشاعروں کے توسط سے ظریفانہ شاعروں نے اکثر و بیشتر فلمی نغموں کے بعض مصرعوں پر پورا پورا بند جوڑ کر مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب تضمین کی مثالیں ہیں۔

پیروڈی: یہ بھی ظریفانہ شاعری کی ایک قسم ہے۔ کسی شاعر کی مشہور غزل یا نظم کے انداز کو اپناتے ہوئے ظریفانہ اشعار کہے جائیں۔ یہ اصل میں اسلوب کی نقل ہے۔ نثر میں بھی بعض افراد نے پیروڈیاں لکھی ہیں۔

دیوان: شاعروں کا وہ مجموعۂ غزلیات جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے کلام جمع کیا گیا ہو، اصطلاحاً دیوان ہے۔ مکمل دیوان کے

لیے یہ شرط ہے کہ تمام حروف پر ختم ہونے والی ردیفوں پر لازماً غزلیں موجود ہوں۔ جس شاعر کے یہاں مختصر تعداد میں دوسری اصناف کے تعلق سے بھی کلام موجود ہو، وہ غزلوں کے بعد اسے شامل کر دیتا ہے۔ ایک صدی پہلے تک جس شاعر کا کم از کم ایک مکمل دیوان موجود نہ ہو اسے معتبر شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی میں دیوان تیار کرنے کا رجحان تقریباً ختم ہو گیا ہے، یہ صرف روایت کا حصہ مانا گیا ہے۔

- **انھیں غور سے پڑھیے:**

مکھن لگانا، دم ہلانا، دم دبانا، چونا لگانا، دال گلنا، کنویں جھانکنا، خاک پھانکنا،

یہ ایسے مجموعۂ الفاظ ہیں جن کے لغوی معنی مختلف ہیں لیکن انھیں واقعتاً دوسرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے ان کے معنی مخصوص ہو گئے اور ہر آدمی انھی معنوں میں برابر استعمال کرتا ہے۔ ایسے مجموعۂ الفاظ محاورے کہلاتے ہیں۔ شعرا کو محاورات سے معنوی رنگارنگی پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

- **آپ اپنی کتاب کے دوسرے اسباق سے دس محاورات منتخب کیجیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔**

آنکھ، ناک، کان، دانت، ہاتھ اور منہ جیسے اعضاے جسمانی سے متعلق بیس محاورے لکھیے اور انھیں اس طرح جملوں میں استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

- نظم 'تشاعر' کے خالق ظفر کمالی ایسے فن کاروں میں شامل ہیں جو شعر گوئی اور تنقید و تحقیق دونوں شعبوں میں اعتبار رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں ظریفانہ شاعری کا مجموعہ 'ظرافت نامہ'، بچوں سے متعلق شاعری کا مجموعہ 'بچوں کا باغ' اور تحقیقی و تنقیدی کتاب 'متعلقاتِ احمد جمال پاشا' گذشتہ دنوں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ وہ ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج، سیوان میں فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں۔ وہ سیوان کے قریب رانی پور گانو میں 3 اگست 1959 کو پیدا ہوئے۔

آیئے، کچھ کریں۔

1. ظفر کمالی کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ 'ظرافت نامہ' اپنے اسکول یا کالج کی لائبریری میں تلاش کیجیے اور اس سے پانچ دوسری پسندیدہ نظمیں چن کر اپنی کاپی میں محفوظ کیجیے۔
2. اپنے اسکول کے سالانہ جلسے میں ایک ڈراما کھیلیے جس میں ایک اصلی شاعر ہو اور ایک تشاعر ہو۔ دونوں کے درمیان گرما گرم بحث کرایئے۔
3. اپنے استاد سے کسی ایسے ہی جعل ساز شاعر کے بارے میں دریافت کیجیے اور اسے سماج میں کس طرح ذلیل و خوار ہونا پڑا، اس موضوع پر ایک کہانی لکھیے۔

یوجینو مونتالے

بیسویں صدی کے عظیم شاعر یوجینو مونتالے 1896 میں جینیوا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے موسیقی اور ادب کی تعلیم حاصل کی جسے پہلی جنگ عظیم کے دوران 1917 میں جبری ملٹری سروس کے سبب نامکمل چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ فلورینس میں گزارا۔ 39-1926 تک وہ فلورینس میں ایک اشاعتی ادارے کے ذمہ دار رہے۔ کئی اخبار و جرائد میں انھوں نے ادارت اور کالم نویسی کے فرائض بھی ادا کیے۔

اطالوی زبان کے اس بہترین شاعر کا پہلا شعری مجموعہ محض 19 سال کی عمر میں 1915 میں شائع ہوا۔ شاعری کے ساتھ ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے شیکسپیئر اور دوسرے فن کاروں کے کارناموں کا اطالوی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ 1967 میں کیمبرج یونی ورسٹی نے انھیں ڈی۔لٹ۔ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1975 میں انھیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ مونتالے اطالوی روایات کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی دنیا سے باخبر رہنا لازم سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی تعبیرات بھی بہت سلجھے ہوئے انداز میں شعری اظہار کا درجہ پاتی ہیں۔

زاہدہ زیدی (مترجم)

زاہدہ زیدی شاعری، تنقید اور ڈراما نویسی تینوں اصناف میں قدرت رکھتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے پروفیسر کے عہدے سے وہ سبک دوش ہوئیں۔ 'زہر حیات'، 'دھرتی کا لمس' اور 'سنگِ جاں' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'دوسرا کمرہ' کے عنوان سے ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ چے خف، سارتر اور بیکٹ کے متعدد ڈراموں کا انھوں نے ترجمہ کیا۔ دنیا کے بعض عظیم شاعروں کے منظوم ترجمے بھی زاہدہ زیدی کے قلم سے یادگار ہیں۔

یوجینو مونتالے

ہم نہیں جانتے

ہم نہیں جانتے ہیں کہ کل کیسی ہوگی
مسرت سے پُر
یا کہ غم کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی
ہم نہیں جانتے
ہم کو یہ راہِ پُر پیچ وخم
نو بہ نو وادیوں کوہساروں، شباب آفریں مرغ زاروں میں لے جائے گی
یا کہ پُر ہَول وتاریک پاتال میں
یا اگر ڈوب جائے اندھیری گپھاؤں میں نورِ سحر
یہ بھی ممکن ہے کچھ اجنبی سرحدوں سے ہمارے قدم جا ملیں
یہ بھی ممکن ہے یہ دیومالا
روایاتِ کہنہ، یہ تاریخ
جن سے تراشا گیا قصۂ زندگی کا بدن
ایک مبہم اندھیرے میں کھو جائیں
پھر زندگی وہ حکایت ہے
جس کی ترسیل ممکن نہ ہو.....

ہاں مگر اتنا معلوم ہے، ہم کو
اے بحر — اے جدِّ امجد
کہ اب ہم جہاں جائیں گے
تیرے آہنگ کو، تیری خاموش سرگم کو بھی ساتھ لے جائیں گے

جو ہماری نواؤں، ہمارے تنفّس میں پیوست ہے
گو صدا تیری خاموش ہوگی
مگر گونج اُس کی نہاں خانۂ دل میں باقی رہے گی
جیسے صحن چمن میں کوئی بوسۂ آفتاب
جس کو وہ یاد میں اپنی محفوظ رکھتا ہے
سورج کے ڈھلنے کے بعد

اور اک روز تیری عنایت کے پروردہ
وہ بے صدا لفظ
جس میں ترا لمس پوشیدہ ہے
خامشی اور واماندگی سے گزر کر
ہماری رگوں میں اُتر آئیں گے
اور ہم اپنے لب پر ترا ذائقہ
موج زن پائیں گے.....

(ترجمہ: زاہدہ زیدی)

کہکشاں : حصہ دوم

لفظ و معنی

دھندلکا - نور کا تڑکا

پُر پیچ - پیچیدہ، مشکل

پُرخم - ٹیڑھا، ترچھا

وادی - گھاٹی، دو پہاڑوں کے بیچ کی زمین

شباب - جوانی

آفریں - کلمۂ تحسین، واہ وا، مرحبا، کیا کہنا

مُرغ زار - سبزہ زار

پُر ہَول - خوف سے بھرا ہوا

روایات - روایت کی جمع

روایت - اظہارِ حکایت، سرگذشت، کسی بات کی نقل

کہنہ - پرانا

تراشنا - کاٹنا، چھیلنا

ہَول - خوف، گھبراہٹ

مبہم - مشکوک، پوشیدہ

ترسیل - بھیجنا، روانہ کرنا

جدامجد - پردادا

آہنگ - نغمہ، آواز

سرگم - راگ کا سُر، راگ کے ساتوں سُر

نَوا - آواز

تنفّس - سانس لینا، دم لینا

پیوست - ملا ہوا، جڑا ہوا

نہاں خانہ - تہہ خانہ، پوشیدہ گھر

لَمس - کسی چیز کو ہاتھ لگانا

صدا
واماندگی - تھکاوٹ، عاجزی
موج زن - ٹھاٹھیں مارنے والا

آپ نے پڑھا

- مونتالے کے پہلے مجموعے OSSI DE SEPPIA میں بحر روم سے مخاطب ہو کر کئی سلسلے وار نظمیں کہی گئی ہیں۔ ہر چند کہ یہ سب اپنی جگہ مکمل اور آزاد ہیں لیکن داخلی سطح پر ان میں ایک معنوی اور فلسفیانہ ربط ہے۔ زاہدہ زیدی نے اپنی کتاب 'سنگ جاں' مطبوعہ جون 1989 میں بحر روم سلسلے کی پانچ نظموں کا منظوم ترجمہ شامل کیا ہے۔ جس سے نظم 'ہم نہیں جانتے' منتخب کی گئی ہے۔ یہ نظم اپنی ذات کی تلاش سے شروع ہو کر کائنات اور زندگی کے گہرے راز کو سمجھنے کی کوشش تک پھیلی ہوئی ہے۔ حیات اور کائنات کا توازن، مونتالے کی نظم کی اصل خصوصیت ہے جسے زاہدہ زیدی نے اپنے کامیاب ترجمے سے زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔
- 'ہم نہیں جانتے' ایک آزاد نظم ہے۔ اسے زاہدہ زیدی نے اطالوی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ نظم نوبل انعام یافتہ یوجینو مونتالے کی لکھی ہوئی ہے۔
- 'ہم نہیں جانتے' ایک جدید طرز کی نظم ہے۔ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایک تنہا انسان اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا نظر آتا ہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر وہ مایوس ہوتا ہے کیوں کہ اسے اپنے آنے والے کل پر اندیشہ ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے 'ہم نہیں جانتے'۔ اس ایک چھوٹے سے جملے سے شاعر نے کئی طرح کے التباس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس جملے کے ذریعہ زمانے کی افراتفری، پیچیدگی اور مسائل کو بالواسطہ طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔
- نظم کے دوسرے حصے میں اس انسان کے اندر امید کی کرن جاگتی ہے۔ اسے زندگی سے کچھ امید ہو آتی ہے، اسے کچھ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تنہائی میں جو باتیں سوچ رہا تھا (وہ جو نہیں جانتا کہ مستقبل میں ایسا ہوگا کہ نہیں)، اس سے الگ وہ سوچتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں 'اتنا معلوم ہے' جس سے اس کے اندر امید کی لہر دوڑ جاتی ہے۔
- زاہدہ زیدی نے اس نظم میں بہت ہی سادہ، سلیس اور رواں الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن اس کے اندر جو معنوی تہیں ہیں، وہ بہت گہری ہیں۔ زاہدہ کی زبان بہت پرکشش ہے۔

آپ بتائیے

1. یوجینو مونتالے کس صدی کے شاعر ہیں؟
2. ان کا پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟
3. شامل نصاب نظم 'ہم نہیں جانتے' کا ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے؟

BSTBPC-2018

4. نظم 'ہم نہیں جانتے' کا اردو ترجمہ کس نے کیا ہے؟
5. 'جن سے تراشا گیا قصۂ زندگی کا بدن' کیا یہ مصرع نظم 'ہم نہیں جانتے' سے ماخوذ ہے؟
6. یہ نظم کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
7. اس نظم میں کس کے آہنگ اور خاموش سرگم کو شاعر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے؟
8. مونتالے اس نظم میں کس کی گونج نہاں خانۂ دل میں باقی رہنے کی بات کرتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. نظم 'ہم نہیں جانتے' میں شاعر نے زندگی کو ناقابلِ ترسیل حکایت کیوں کہا ہے؟
2. اس نظم کے پہلے حصے میں شاعر نے کیا باتیں کہی ہیں؟
3. 'اے بحر۔ اے جدِ امجد' سے مخاطب ہو کر شاعر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. نظم 'ہم نہیں جانتے' میں شاعر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟
2. اس نظم کی شاعرانہ خوبیوں کو واضح کیجیے۔
3. یوجینو مونتالے یا زاہدہ زیدی سے اپنی واقفیت ظاہر کیجیے۔

- نیچے دیے گئے ہم صَوت الفاظ کے معنی لکھیے۔

صَدا۔ سَدا، کھانا۔ خانہ، صحن۔ سہن، نذر۔ نظر، باد۔ بعد

- متضاد الفاظ لکھیے۔

پوشیدہ، مسرّت، تاریک، زندگی، ممکن، جدا، خاموشی

آیئے، کچھ کریں

1. اس نظم کے علاوہ مغربی ادب کی اور بھی نظمیں اردو زبان میں موجود ہیں، انھیں جمع کیجیے۔
2. اطالوی زبان کے متعلق اپنے انگریزی کے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
3. زاہدہ زیدی کون ہیں؟ ان کے بارے میں اپنے استاد سے دریافت کیجیے۔

غزل

عربی قصائد کی تشبیب سے فارسی شاعروں نے غزل جیسی صنف ایجاد کی جس کا لفظی معنیٰ عورتوں سے بات کرنا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے فارسی اور اردو غزل کی تاریخ عشقیہ مضامین سے بھری پڑی ہے۔ غزل کے پہلے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے ثانی مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے لازماً ہم قافیہ وہم ردیف ہوں گے، ''مطلع'' کہلاتا ہے۔ بعض اوقات شعرا ایک سے زائد مطلعے کہہ دیتے ہیں جنھیں ''حسنِ مطلع'' کہا جاتا ہے۔ غزل کے آخری شعر میں بالعموم شعرا اپنا قلمی نام یا تخلص استعمال کرتے ہیں، اس شعر کو ''مقطع'' کہتے ہیں۔

غزل کے اشعار کی تعداد مخصوص نہیں۔ قدیم شاعروں نے کم سے کم پانچ اشعار کی روایت قائم کر رکھی تھی لیکن مختلف شاعروں نے اس سے گریز کرتے ہوئے چار اور تین اشعار کی غزلیں بھی اپنے دیوان میں شامل کی ہیں۔ اس کی نمایاں مثال دیوانِ غالب ہے۔ غالب کے اثر سے دورِ جدید میں پانچ اشعار سے کم کی غزل کو مجموعے میں شامل کرنے کا رجحان عام ہو گیا۔ ارکان بڑھا گھٹا کر نظمِ آزاد کی طرح آزاد غزل کہنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن یہ تجربہ ہی رہا۔

غزل میں مضامین کی کوئی قید نہیں۔ ابتدا میں تو صرف عاشقانہ خیالات پر ہی توجہ دی گئی لیکن رفتہ رفتہ غزل نے اپنے دائرۂ کار کو وسیع کیا اور اس میں آج ہر طرح کے مضامین کی شمولیت کی گنجایش ہے۔ تمام مسائل و معاملات کے اظہار کے لیے غزل کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تصوّف کے ساتھ رندی، عاشقی کے ساتھ بوالہوسی، روحانیت کے ساتھ خالص دنیاداری جیسی متضاد تصویروں کو بھی غزل نے اپنی آغوش میں سجا رکھا ہے۔

وقت کی تبدیلی کے ساتھ غزل نے اپنے اندرون میں کافی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ہر عہد میں غزل گو شاعروں کی مقبولیت قائم رہی۔ ولؔی سے لے کر میرؔ تک، غالبؔ سے لے کر اقبالؔ تک، فیضؔ سے لے کر بشیر بدرؔ تک، عرفان صدیقیؔ سے لے کر شجاع خاورؔ تک اور اسعد بدایونیؔ سے لے کر خورشید اکبرؔ تک اردو غزل میں اس قدر مستحکم اور توانا اسالیبِ اظہار پیدا ہوئے جن کی بدولت ہر دور میں غزل کی مرکزیت قائم ہوئی۔ اردو کے اثر سے ہندی میں غزل گوئی کا رواج چل پڑا اور وہاں سیکڑوں کی تعداد میں غزل گو شعرا اُبھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ ہندستان کی علاقائی زبانوں میں بھی متعدد غزل گو پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ سب اس صنف کی مقبولیت کے شواہد ہیں۔ مختلف گلوکاروں نے بھی غزل گائکی کے راستے سے اردو غزل کو مقبولِ عام بنانے میں موثّر کام کیا۔

اسداللہ خاں غالب

مرزا غالبؔ جن کا پورا نام اسداللہ بیگ خان تھا، 27 دسمبر 1797 کو اپنی ننھیال آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا عزت النسا بیگم تھا۔ غالبؔ کے نانا خواجہ مرزا غلام حسین خاں سرکارِ میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرہ کے عمائد میں سے تھے۔

غالب ابھی بچّے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا لیکن چند برسوں بعد وہ بھی اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے بعد غالب اپنی ماں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں لیکن اتنا پتا ہے کہ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی معظّم کے ذریعے ہوئی۔ مولوی معظّم کی تلمّذی کے زمانے میں ہی غالب کی شعرگوئی کی ابتدا ہو چکی تھی۔

تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی خاندانِ لوہارو میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے چند برسوں بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں انھیں خاصی مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاندانی پنشن کے سلسلے میں انھوں نے کلکتے کا طویل سفر کیا لیکن انھیں نامرادی ہاتھ لگی۔ جب اُن کا باضابطہ تعلّق قلعۂ معلّا سے ہوا تو حالات میں قدرے بہتری آئی لیکن غدر کے ہنگامے نے ساری بساط ہی پلٹ دی۔ رام پور کے دربار سے وابستگی اور قلعۂ معلّا سے پنشن کی واگذاشت کے باوجود وہ پریشان ہی رہے اور اسی عالم میں 15 فروری 1869 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ 'پنج آہنگ'، 'مہرِ نیم روز'، 'دستنبو'، 'قاطع برہان'، 'درفش کاویانی' اور 'کلیاتِ نظمِ فارسی' وغیرہ ان کی فارسی تصنیفات ہیں۔ اردو میں متداول دیوان کے علاوہ مرزا کی زندگی میں ہی ان کے اردو خطوط کے دو مجموعے 'عودِ ہندی' اور 'اردوے معلّا' کے نام سے چھپے۔ بعد میں لوگوں نے مختلف ناموں سے ان کی بکھری تخلیقات کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان کا تخلّص پہلے اسدؔ تھا، بعد میں انھوں نے غالبؔ تخلّص اختیار کیا۔ غالبؔ کی طبیعت میں جدّت پسندی تھی۔ شروع میں انھوں نے معروف فارسی شاعر بیدلؔ کی پیروی کی لیکن بہت جلد اس رنگ کو چھوڑا اور نئی راہ اختیار کی۔

غالبؔ کے خطوط بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اپنے مکتوبات میں انھوں نے بے تکلّفانہ لہجہ اختیار کیا۔ بیان کی سادگی، لہجے کے سوز اور ظریفانہ اندازِ بیان نے ان کے خطوط کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اس سے نہ صرف غالب کی ذہنی روِش کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی شخصیت بھی نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

غزلیں

(۱)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زُمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۲)

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو، کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

ہم مُوحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

لفظ و معنی

(۱)

دائم	-	سدا، ہمیشہ
گردشِ مدام	-	ہر وقت کی مصیبت
مدام	-	ہمیشہ
حرفِ مکرّر	-	دوبارہ لکھا ہوا حرف
لوح	-	تختی
عزیز	-	پیارا، صاحبِ مرتبہ
لعل	-	جواہر، ایک بیش قیمت پتھر
زمرّد	-	سبز رنگ کا قیمتی پتھر
زر	-	سونا
گوہر	-	موتی، جواہر
وظیفہ خوار	-	پنشن پانے والا، وظیفہ لینے والا

(۲)

نمایاں ہونا	-	ظاہر ہونا
پنہاں	-	پوشیدہ، چھپا ہوا
روزن	-	سوراخ، روشن دان
زندان	-	قید خانہ
جوئے خوں	-	خون کی ندی یا نہر
فروزاں	-	روشن
شامِ فراق	-	جدائی کی شام
دبستان	-	اسکول، مدرسہ
نالہ	-	آہ و زاری
موحّد	-	خدا کو ایک ماننے والا
کیش	-	مذہب، اعتقاد، عادت

ترک کرنا	۔	چھوڑنا
رسوم	۔	رسم کی جمع، قوانین، عادتیں
ملّت	۔	مذہب، فرقہ
اجزا	۔	جز کی جمع، حصے
خوگر ہونا	۔	عادی ہونا
اہلِ جہاں	۔	دنیا کے لوگ

آپ نے پڑھا

- غالب کی یہ دونوں غزلیں بے حد معروف ہیں۔ ان میں شامل کئی اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ان میں زندگی کے تجربات کے تئیں ایک ہوش مند اور حساس شاعر کے معنی خیز فکر و احساس کا اظہار ہوا ہے۔
- پہلی غزل کے تمام اشعار مضامین کے اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر ان میں مزاج اور تجربے کے اعتبار سے ایک باہمی ربط اور اندرونی وحدت پائی جاتی ہے۔ احساسات کی اندرونی بے چینی، اضطراب اور تلملاہٹ سے مختلف رنگوں سے آراستہ اس غزل کے اشعار ایک خاص موڈ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تجربہ کی سطح پر اس غزل کے تمام اشعار غم واندوہ سے معمور ہیں اور بے قدر، بے توقیر، کم حیثیت اور بے مایہ ہونے کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پتھر، پیالہ و ساغر، حرف مکرر، لعل و زمرّد، زر و گوہر اور ان کے ساتھ ہی نوکر جیسی اشیا اور فرد کی حیثیتوں کے مقابل 'نہیں ہوں میں' کہہ کر غالب نے اپنے انھی احساسات کی عکاسی کی ہے۔ اپنے زمانے میں غالب نے جس طرح کس مپرسی، بے بسی اور کم مائیگی کی زندگی گزاری، ان اشعار سے بہ خوبی اس کا علم ہمیں ہو جاتا ہے۔
- دوسری غزل کے ہر شعر میں کسی نہ کسی منظر یا تماشے کو دکھانے کا تیور موجود ہے۔ اور یہ تمام غالب کی فکر کی نئی جہتوں اور ان کے احساس کی رنگا رنگ اور متنوع لہروں کو منفرد شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کسی منظر یا تماشے کے تعلق سے اپنے مخصوص استفہامی اور خود کو دریافت کرنے والے ہوش مند تیور کے ساتھ غالب ان اشعار میں موجود ہیں۔

آپ بتائیے

1. 'دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں'— یہ بات شاعر نے کس سے کہی ہے؟
2. شاعر کو کون مٹانا چاہتا ہے؟
3. انھیں کون لوگ نہیں جانتے ہیں؟
4. 'وہ دن گئے' کہہ کر شاعر کیا بتانا چاہتا ہے؟

5. غالب نے وظیفہ خوار کس کو کہا ہے؟
6. شاعر کے روتے رہنے سے کیا ہوگا؟
7. چمن میں کس کے جانے سے دبستان کھل گیا؟
8. یعقوبؑ اور یوسفؑ میں کیا نسبت ہے؟
9. مُوحّد کسے کہتے ہیں؟
10. 'رنج سے خوگر' ہونے سے کیا مراد ہے؟

مختصر گفتگو

1. شاعر نے بتایا کہ وہ پتھر نہیں ہے۔ اس نے یہ بات کیوں کہی؟
2. شاعر نے اپنے متعلق یہ بات کیوں کہی کہ وہ 'لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر' نہیں ہے؟
3. پہلی غزل میں شاعر کے کن تجربوں کا بیان ہوا ہے؟
4. 'بلبلیں غزل خواں' کیوں ہو گئیں؟
5. شاعر کے مطابق مشکلیں کیسے آسان ہو جاتی ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1. شاملِ نصاب غزلوں کی روشنی میں غالب کی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. غالب کی دوسری غزل کے کوئی دو اشعار کی تشریح کیجیے۔
3. غالب کی زندگی کے حالات بیان کیجیے۔
4. 'غالب کی شاعرانہ عظمت' عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اس غزل میں ایک جگہ لعل و زمرّد و زر و گوہر کا ذکر ہے۔ آپ کتب خانے جا کر اردو انسائیکلوپیڈیا کی مدد سے ان الفاظ کے معنی اور ان کے باہمی فرق کو سمجھیے۔
2. اپنے اسکول یا نزدیکی کتب خانے جا کر 'دیوانِ غالب' حاصل کیجیے اور مرزا غالب کے نمایندہ اشعار اپنی ڈائری میں نوٹ کر کے اپنے استاد کی مدد سے ان کے معنی و مفاہیم سمجھیے۔

یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی 17 اکتوبر 1884 کو پٹنہ سٹی کے محلے مغل پورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین عرف مرزا پیارے صاحب تھا۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید حسرت کے مدرسے میں اور اس کے بعد محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ 1903 میں انٹرنس پاس کیا۔ 1904 میں کلکتہ گئے۔ وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی تو پٹنہ واپس آ گئے۔ علاج و معالجہ کے لیے 1905 میں لکھنؤ گئے اور اپنی زندگی کا بیش تر حصہ وہیں پر بسر کیا۔ 1913 میں حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی کی صاحب زادی کنیز حسین سے ان کی شادی ہوئی۔

یگانہ نے ذریعۂ معاش کے طور پر کچھ دنوں تک اودھ اخبار میں نوکری کی۔ 1923 میں یہ ملازمت ختم ہوئی تو ایک مختصر میعاد کے لیے ریلوے میں کلرک رہے۔ 1924 میں وہ اٹاوہ گئے جہاں اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت کی۔ 1926 میں اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے ہمراہ لاہور آئے اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے علمی ادارے 'اردو مرکز' سے وابستہ ہو گئے۔ لاہور قیام کے دوران ان کی ملاقاتیں علامہ اقبال سے ہوتی رہیں اور لاہور ہی سے پورے ملک میں ان کی ادبی شہرت پھیلی۔ 1927 کے آخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ یہاں وہ پہلے محکمۂ رجسٹریشن میں نقل نویس اور بعد میں سب رجسٹرار ہوئے۔ ان کا مختلف جگہوں پر تبادلہ ہوتا رہا۔ 1942 میں وہ ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ آئے جہاں ان کے اہل و عیال رہتے تھے۔ مالی تنگی کی وجہ سے وہ برابر حیدرآباد آتے جاتے رہے۔ معاشی اعتبار سے وہ ہمیشہ پریشان ہی رہے۔

یگانہ کے دونوں بیٹے اور بڑی بیٹی پاکستان جا چکے تھے۔ 1951 میں بیگم یگانہ بھی پاکستان چلی گئیں۔ یگانہ اس کربناک تنہائی کو برداشت نہیں کر سکے اور خود بھی پاکستان جا پہنچے۔ 1952 میں وہاں سے واپس لکھنؤ آئے۔ اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں انھوں نے بہت مصیبتیں جھیلیں۔ آخر کار 1956 میں تین چار فروری کی درمیانی رات میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کربلائے منشی تفضل حسین (وکٹوریا گنج) میں تدفین عمل میں آئی۔

یگانہ کی انانیت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے شعرائے لکھنؤ سے ان کی خاصی چشمک رہی۔ انھوں نے مختلف لوگوں کے خلاف لکھا جس میں غالب، اقبال اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ 'نشترِ یاس'، 'آیاتِ وجدانی'، 'ترانہ' اور 'گنجینہ' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

غزلیں

(۱)

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہَوَس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھُلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

خدا ہی جانے یگانہ، میں کون ہوں، کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

(۲)

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جُرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا! آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پانو پھیلانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں، کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

لفظ و معنی

(۱)

پہلو ۔ زانو، بازو

شوق ۔ خواہش، اشتیاق

پہلو دبانا ۔ حریف کے پہلو پر زور دینا، بازو دبانا، دشمن کی فوج کے کسی حصے پر چڑھائی کر دینا، غالب آجانا

عبث ۔ بے فائدہ، بے کار

لغزش ۔ خطا، گمراہی

(۲)

ناخدا ۔ ملاح

اسیر ۔ قیدی

چادر دیکھ کر پانو پھیلانا ۔ اپنی حیثیت کے مطابق کام کرنا

سراپا ۔ سر سے پانو تک

آپ نے پڑھا

- ابھی آپ نے یگانہ کی دو غزلیں پڑھیں۔ اب پہلی غزل کی بعض باتوں پر غور کرتے ہیں۔ اس کا تیسرا شعر دیکھیے۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

پہلے مصرعے میں ایک تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ شعری اصطلاح میں اسے تلمیح کہتے ہیں۔ فرہاد نے کبھی شیریں کو پانے کے لیے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی لیکن وہ کوہ کن (یعنی فرہاد) بھی آخر کار اسی مٹی میں مل گیا۔ یہاں یگانہ کا ہنر یہ ہے کہ متذکرہ تاریخی قصے کو من و عن یا لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے زندگی کے انجام اور دنیا کی بے ثباتی کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ زمین میں دریاؤں کے سمائے ہونے کی بات بھی کرتے ہیں۔

- غزل کے چوتھے شعر کو ملاحظہ کیجیے:

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

یہاں بھی خیال وہی ہے جسے آپ نے تیسرے شعر میں پڑھا تھا لیکن اس شعر میں بلندی اور پستی کی مثال پیش کی گئی ہے۔ یہاں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یگانہ اپنی بات کو مزید زوردار اور پر اثر بنانے کے لیے ایک خیال کو مختلف پیرایۂ اظہار عطا کرتے ہیں۔

- پانچویں شعر کے دوسرے مصرعے پر نظر ڈالیے:

وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

آپ یہاں عشقیہ مفہوم بھی لے سکتے ہیں اور اہل زمانہ کی ناقدری یا اسی انداز کے دوسرے مفاہیم بھی ذہن نشیں کر سکتے ہیں۔ یہ سب آپ کی طبیعت پر منحصر ہے۔ غزل کی آپ نے جو تعریف پڑھی ہوگی، اس کے لحاظ سے غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے لیکن جس مصرعے پر آپ غور کر رہے ہیں، وہ تو تنہا اپنی جگہ مکمل نظر آتا ہے۔

- اب اس غزل کے لفظی نظام پر توجہ کیجیے۔ آپ ہر شعر کے دوسرے مصرعے پر غور کیجیے۔ اس میں پہلے ہم ''کیا کیا'' کو الگ کر کے بقیہ الفاظ کو اسی ترتیب میں رکھتے ہوئے جیسے وہ شعر میں استعمال ہوئے ہیں، ایک فہرست بناتے ہیں—

(۱) ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں

(۲) اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں

(۳) اسی زمین میں دریا سمائے ہیں

(۴) بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں

(۵) وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں

(۶) خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں

- آپ نے بہت سارے شعرا کو پڑھا ہوگا اور ان کے کلام میں لفظوں کی ترتیب روز مرّہ کے استعمال سے علاحدہ پاتے ہوں گے لیکن یگانہ کے یہاں تو مسلسل مکمل نثری ترتیب دیکھ رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی غزل کو پڑھتے ہوئے نثر کا گمان نہیں ہوتا۔ اسے نثر ہونے سے بچانے کے لیے ہی 'کیا کیا' کی تکرار ہے۔ یہ 'کیا کیا' فن کی ضرورت کو تو پورا کرتا ہی ہے، ساتھ ہی پیش نظر خیال کو اس کی آخری حد تک بھی پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

- دوسری غزل میں بھی باتیں اسی سلیقے سے پیش کی گئی ہیں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے نئی معنوی تہیں یہاں دریافت کی جا سکتی ہیں اور فن کے حسن سے بھی محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ اس غزل کے تیسرے شعر میں فرہاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن معنوی سطح پر ایک نئی صورت پیدا کی گئی ہے۔

- اس غزل میں یگانہ کے یہاں انانیت، زمانے سے نبرد آزمائی کا جذبہ اور حوصلہ موجود ہے۔ پہلے شعر میں زمانے کے الزامات کو رد کرتے ہیں اور اپنی کارکردگی سے مطمئن ہوتے اور اسے صحیح تصوّر کرتے ہیں۔

- دوسرے شعر میں خود پر لگے الزامات اور رسوائی سے ڈر کر نہیں بھاگتے ہیں بلکہ حوصلہ مندی سے زمانے سے مقابلہ آرا ہیں۔ ایسا اس لیے کہ اس دنیا کے بعد دوسری دنیا میں انھیں خدا کو منہ دکھانا ہے۔ اس کا سامنا کرنا ہے۔

- غزل کے پانچویں شعر میں طنزیہ لہجہ جو یگانہ کی شاعری کا اصل وصف ہے، دکھائی دیتا ہے۔ اپنی بلندی اور مرتبے کا احساس جو

زمانے سے انھیں جیتے جی نہ مل سکا، اس کی جھلک اس شعر میں ملتی ہے۔

- بول چال اور روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے عام محاورات اور ضرب الامثال کو یگانہ اپنی شاعری میں اکثر و بیش تر بہت آسانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے پرایا جرم اپنے نام لکھوانا، کسی کو منہ دکھانا، مصیبت کا پہاڑ، آنسو پینا، غم کھانا، چادر سے باہر پانو پھیلانا وغیرہ۔

آپ بتایئے

1. یگانہ کا اصلی نام کیا ہے؟
2. یگانہ کے کیا معنی ہیں؟
3. یگانہ چنگیزی پہلے کیا تخلص کرتے تھے؟
4. 'پہاڑ کاٹنے والا' کی اصطلاح کس کے لیے استعمال کی جاتی ہے؟
5. مصرعے درست کیجیے :
   (i) خطا پر دل کی مجھے یاس نہیں شرمانا آتا
   (ii) سر مار کر مجھے تیشہ سے مرجانا نہیں آتا
   (iii) زمیں کاٹنے والے پہاڑ سے ہار گئے
6. یگانہ چنگیزی کس کے شاگرد تھے؟
   (۱) شاد عظیم آبادی (۲) جگر مرادآبادی (۳) جمیل مظہری (۴) جوش ملیح آبادی
7. یگانہ چنگیزی کی پیدائش کب ہوئی؟
   (۱) ۱۸۸۲ء (۲) ۱۸۷۸ء (۳) ۱۸۸۳ء (۴) ۱۹۸۳ء
8. یگانہ کی وفات کہاں ہوئی؟
   (۱) عظیم آباد (۲) دہلی (۳) آگرہ (۴) لکھنؤ
9. 'وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا'۔ اس کا پہلا مصرع لکھ کر شعر کو مکمل کیجیے۔
10. ان کے ثانی مصرعے لکھیے۔
    (i) ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
    (ii) خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
    (iii) پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
    (iv) خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں

مختصر گفتگو

1. یگانہ کی غزل سے اپنی پسند کا شعر نقل کیجیے اور اپنی پسندیدگی کا سبب بتائیے۔
2. 'اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا'۔ یہاں زمین میں دریا سمائے ہیں، سے کیا مراد ہے؟
3. 'سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا'۔ یگانہ دنیا کو سمجھانا نہیں آتا، کیوں کہہ رہے ہیں؟
4. درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

(i) خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں، کیا ہوں — خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

(ii) اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے — مگر چادر سے باہر پانو پھیلانا نہیں آتا

تفصیلی گفتگو

1. اپنے سبق کے حوالے سے یگانہ کی غزل گوئی پر نوٹ لکھیے۔
2. دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں — وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا — مجھے سرمار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

درج بالا اشعار کی تشریح معنوی ربط کی تلاش کرتے ہوئے کیجیے۔

3. یگانہ کن موضوعات کو خاص طور سے غزل کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں؟ اپنے سبق کے حوالے سے جواب دیجیے۔
4. یگانہ نے اردو غزل کی تاریخ میں کون سا تجربہ کیا؟ اس موضوع پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

- درست مصرعوں کے آگے (✓) کا نشان لگائیے۔

(i) پیڑ کاٹنے والے دریا سے ہار گئے
پہاڑ کاٹنے والے پیڑ سے ہار گئے
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے

(ii) غم میں اپنے ہاتھ چوم لوں تو زیبا ہے
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
غم میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے

- درج ذیل اشعار میں قافیہ اور ردیف کی نشان دہی کیجیے۔

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا — پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں، کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں — سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا　　مجھے سرمار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

- خانہ 'الف' کے مصرعوں کو خانہ 'ب' کے مصرعوں سے مکمل کیجیے۔

دل بے حوصلہ ہے اک	کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں
سراپا راز ہوں میں	آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
مصیبت کا پہاڑ آخر	اتر جانا نہیں آتا
بہانہ کر کے تنہا پار	ذرا سی ٹھیس کا مہماں
مجھے اے ناخدا!	کسی دن کٹ ہی جائے گا

- حسب ذیل الفاظ کی جنسیت جملوں کے ذریعے ظاہر کیجیے۔

ادب، لغزش، شک، خطا، حوصلہ، آزادی، ذات، دریا، فریب، زمین

آیئے، کچھ کریں

1. یگانہ کی کسی ایک غزل میں پیش کردہ خیال کو نثر کے سانچے میں ڈھالیے۔
2. یگانہ کی غزلوں کا مجموعہ حاصل کیجیے اور اپنی پسند کی غزلوں کو نوٹ کیجیے۔
3. یگانہ کی نثری کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے اور ان کا مطالعہ کیجیے۔

خلیل الرحمان اعظمی

خلیل الرحمان اعظمی، اعظم گڑھ کے گانو سیدھا سلطان پور میں 9 اگست 1927 کو پیدا ہوئے۔ ان کے گھر میں مذہبی اور ادبی ماحول شروع سے قائم تھا۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں ہوئی۔ بعد میں اعلا تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ آئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اعظم گڑھ اور علی گڑھ کی علم پرور فضا میں ان کی ادبی پرورش و پرداخت ہوئی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بی۔ اے۔ کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے آتش کی شاعری پر مشہور رسالہ 'نگار' میں قسط وار قسط جو مضمون شائع کرایا، اس نے انھیں معتبر ادیبوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ 1952 میں بہ حیثیت لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ میں ان کا تقرر ہوا۔ ملازمت کے دوران ہی یکم جون 1978 کو محض 51 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

خلیل الرحمان اعظمی ایک ساتھ شاعر اور نقاد دونوں حیثیتوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔ شاعری میں بھی وہ نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنی مستحکم ادبی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ جدیدیت کے آغاز کے مرحلے میں جب 'پیروی میر' کو بہت اہمیت حاصل تھی، اس واسطے سے بھی خلیل صاحب، ناصر کاظمی اور ابن انشا کے ساتھ نمایاں طور پر پہچانے گئے۔ ان کی کتاب 'نئی نظم کا سفر' اب بھی نئی نظم کا سب سے معیاری اور معقول انتخاب تسلیم کی جاتی ہے۔

ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ 'کاغذی پیرہن' (1955)، 'نیا عہد نامہ' (1965)، 'زندگی، اے زندگی' (1983)، 'آسماں، اے آسماں' کے نام سے ان کی شاعری کا ایک انتخاب بھی 2000 میں منظر عام پر آیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'فکر و فن' (1956)، 'زاویۂ نگاہ' (1966) اور 'مضامینِ نو' (1977) ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا انتخاب تفصیلی مقدمے کے ساتھ 'نوائے ظفر' کے نام سے 1975 میں شائع ہوا۔ اسی طرح 1976 میں مثنوی 'سحر البیان' پر بھی ایک بھرپور مقدمہ لکھ کر انھوں نے شائع کیا۔ 'مقدمۂ کلامِ آتش' کتابی شکل میں 1959 میں منظر عام پر آیا۔ رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں خلیل الرحمان اعظمی نے تحقیق کی تھی۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' 1972 میں چھپ کر منظر عام پر آیا، جسے اب بھی معیاری تحقیقی مقالات کے ضمن میں ایک نمونے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

خلیل الرحمان اعظمی اپنی تنقید میں توازن اور شاعری میں گہرے انسانی سوز کی شمولیت کے لیے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے یہ محزونیت ان کی شاعری میں بڑھتی ہی گئی۔ آخری زمانے میں ان کے یہاں موت کا احساس اور زندگی کے سمٹنے کا انداز بار بار ابھرتا ہے۔ اپنی طویل بیماری کے دوران تو انھوں نے اپنے کتبے بھی لکھ لیے تھے۔ لیکن اس غم انگیزی میں زندگی کے حقائق سے فرار کے بجائے مقابلہ آرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی خلیل صاحب کی شاعری کا سب سے روشن پہلو ہے۔

غزلیں

خلیل الرحمان اعظمی

(۱)

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھانو میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا ادھڑ گیا

یاروں نے خوب جاکے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بددماغ یہاں بھی پچھڑ گیا

کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

(۲)

ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی! اے زندگی! رتبہ رہے بالا ترا

اپنا مقدر تھا یہی! اے منبعِ آسودگی
بس تشنگی، بس تشنگی، گو پاس تھا دریا ترا

اس گام سے اس گام تک، زنجیرِ غم کے فاصلے
منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستا ترا

تو کون تھا، کیا نام تھا، تجھ سے ہمیں کیا کام تھا
ہر پردۂ دل پر ابھی دھندلا سا اک چہرہ ترا

سورج ہے گو نامہرباں، ہے سر پہ نیلا سایباں
اے آسماں! اے آسماں! دائم رہے سایہ ترا

لفظ و معنی

(۱)

عیادت - بیمار کے گھر جا کر مزاج پُرسی کرنا

صلح - دو فریق کے درمیان میل ملاپ

تاویل - شرح، بہانہ، بچاو کی دلیل

(۲)

نغمہ - گیت

رتبہ - مرتبہ، عہدہ

منبع - چشمہ، پانی کے نکلنے کی جگہ

آسودگی - آرام، راحت

تشنگی - پیاس

گام - ایک قدم کا فاصلہ، قدم

سایباں - چھپّر، دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے ٹین کی چادروں اور پھوس کا چھپر، شیڈ (یہاں مراد ہے آسمان)

دائم - مدام، سدا، ہمیشہ

آپ نے پڑھا

- زیرِ مطالعہ غزلوں کے اشعار میں گہری محزونیت چھائی ہوئی ہے لیکن یہاں حزن و یاس کی جو کیفیت ہے، اس میں افسردگی اور ناامیدی نہیں ہے اور نہ ہی زندگی سے فرار کی حالت ہے بلکہ ان اشعار میں زندگی سے مقابلہ کرنے کی تحریک ملتی ہے۔
- پہلی غزل میں شاعر نے جو لفظی نظام قائم کیا ہے، اسے غور سے دیکھیں۔ مثلاً دشمن، سایۂ غم، چھانو، عیادت، دل، زخم، ٹانکا، بد دماغ، خیالوں کے شہر وغیرہ۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر چھپے غم و افسردگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ساتھ ہی شاعر کی زندگی کے گہرے تجربات کا بھی احساس ہوتا ہے۔
- پہلی غزل میں شاعر بچھڑ، اکھڑ، ادھڑ، بگڑ، اجڑ جیسے قافیوں کا استعمال کرتا ہے۔ ان الفاظ کو ہی صرف زیرِ بحث رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر نے قلبی واقعات کے ساتھ اپنے جذبات کی شمولیت کر دی ہے۔ تبھی ان اشعار میں درد اور ٹیس کی شدت حد سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

- دوسری غزل میں شاعر نے انسانی زندگی کے گہرے تجربات کو پیش کیا ہے۔ یہ غزل اس نے زندگی کے آخری دور میں کہی جب وہ ہر قدم پر موت کی آہٹ سن رہا تھا۔ پہلے شعر میں وہ موت کی بانسری پر زندگی کا گیت گانے کی بات کرتا ہے۔ یہ اس کی رجائیت پسندی کی بہترین مثال ہے۔

(i) اے زندگی! اے زندگی! رتبہ رہے بالا ترا
(ii) بس تشنگی، بس تشنگی، گو پاس تھا دریا ترا
(iii) اس گام سے اس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے

- ان مصرعوں کو آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو بعض لفظوں کے درمیان تکرار کی صورت دکھائی دے گی۔ یہ التزام شاعر معنوی وسعت پیدا کرنے کے لیے کرتا ہے۔ شاعر کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے تکرار سے اشعار میں شدت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس گام سے اس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے
منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستا ترا
سورج ہے گو نامہرباں، ہے سر پہ نیلا سائباں
اے آسماں! اے آسماں دائم رہے سایہ ترا

- ان اشعار میں آپ ظاہری طور پر دیکھیں گے کہ غم و افسردگی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن جب اس کی معنوی وسعت پر غور کریں گے تو یہ احساس ہوگا کہ یہاں غم سے ہار کر بیٹھ جانے کا نام زندگی نہیں ہے بلکہ مشکل وقت سے لڑنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کا نام زندگی ہے۔ یہی شاعر کا اصل مقصد ہے۔

آپ بتائیے

1. خلیل الرحمان اعظمی کہاں پیدا ہوئے تھے؟
2. خلیل الرحمان اعظمی کا پیشہ کیا تھا؟
3. خلیل الرحمان اعظمی کا تعلق کس تعلیمی ادارے سے رہا؟
4. ان کے ایک مجموعے کا نام بتائیے۔
5. کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' کس کی لکھی ہوئی ہے؟
6. خلیل الرحمان اعظمی کے دو ہم عصروں کے نام بتائیے۔

مختصر گفتگو

1. خلیل الرحمان اعظمی کی شاعری میں کیسی کیفیت پائی جاتی ہے؟
2. دوسری غزل کا قافیہ اور ردیف اپنی کاپی پر لکھیے۔
3. نیلا سائباں سے کیا مراد ہے؟
4. خلیل الرحمان اعظمی کا تعلق اردو ادب کی کس تحریک سے رہا ہے؟
5. انھوں نے اپنی شاعری کس بڑے شاعر کے اتباع میں کی؟

تفصیلی گفتگو

1. خلیل الرحمان اعظمی کی شاعرانہ خصوصیت پر روشنی ڈالیے۔
2. خلیل الرحمان اعظمی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. تشریح کیجیے۔

(i) یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بددماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

(ii) اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

(iii) ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی! اے زندگی! رتبہ رہے بالا ترا

(vi) سورج ہے گو نامہرباں، ہے سر پہ نیلا سائباں
اے آسماں! اے آسماں! دائم رہے سایہ ترا

4. صحیح مصرعے کی پہچان کریں۔

1. (i) اب کیا بتائیں خیالوں کے شہر میں کیا تھا
(ii) خیالوں کے شہر میں کیا تھا اب کیا بتائیں
(iii) اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں

2. (i) ہم بانسری پر گاتے رہے نغمہ ترا موت کی

(ii) گاتے رہے نغمہ ترا ہم بانسری پر موت کی

(iii) ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا

3. (i) منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستا ترا

(ii) چلتا رہے رستا ترا، منزل تو کیا ہم کو ملے

(iii) منزل تو کیا ملے ہم کو، رستا ترا چلتا رہے

- مندرجہ ذیل الفاظ کی جنسیت جملوں سے ظاہر کیجیے۔

ہوا، عبادت، صلح، نغمہ، مقدر، مہربان

- واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنایئے۔

دشمن، یاروں، زمانہ، کوتاہی، مہربانیاں، منزل، اموات، زنجیر، زندگیوں

آئیے کچھ کریں

1. خلیل الرحمان اعظمی کی پانچ کتابوں کی تلاش اپنی لائبریری سے کیجیے اوران کا مطالعہ کیجیے۔
2. خلیل صاحب کے پانچ ہم عصروں کے نام بتایئے۔
3. خلیل الرحمان اعظمی کا ایک شعری مجموعہ حاصل کیجیے اوران کا مطالعہ کیجیے۔

قطعۂ تاریخ

اردو میں تاریخ گوئی دوسری کئی صنفوں کی طرح فارسی شاعری سے آئی ہے۔ فارسی میں اس فن کا آغاز کب اور کس واقعے سے ہوا، اس کی تحقیق اب تک نہیں ہوسکی ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ اس کے ابتدائی نمونے کی تلاش سلجوقی دور (428ھ تا 622ھ، دسویں تا بارھویں صدی عیسوی) میں کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے اردو شاعری کے پروان چڑھنے تک یہ صنف بے حد بالیدہ ہوچکی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ گوئی کے نمونے اردو کے کلاسیکی شعرا کے یہاں موجود ہیں۔

تاریخ گوئی ایک فن ہے اور یہ انھی زبانوں میں رائج ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ ولادت، شادی، وفات، کتابوں کی تصنیف، بادشاہوں کی تخت نشینی، فتوحات، خطاب یابی، منصب پر ماموریت اور عمارت کی تعمیر وغیرہ گویا ہر طرح کے اہم واقعات کے سال کو محفوظ رکھنا اس فن کا مقصد ہے۔ کامیاب قطعۂ تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اس سے متعلقہ واقعے کی وضاحت بھی ہوجائے اور اس کے اعداد جوڑنے سے واقعے کا سال بھی برآمد ہوجائے۔ اس فن کے ذریعہ تاریخ گو ایسا مصرع، جملہ یا فقرہ ترتیب دیتا ہے، جس کے حروف کے اعداد جوڑنے سے اس سال کی تاریخ برآمد ہوتی ہے جس سال وہ اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایسے مصرعے، جملے یا فقرے کو 'مادۂ تاریخ' کہتے ہیں۔

تاریخ گوئی ایک مشکل لیکن دل چسپ فن ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اس لیے مسلّم ہے کہ تاریخیں عام طور سے اسی زمانے میں کہی جاتی ہیں، جس زمانے میں واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس طرح متعلقہ واقعے اور 'مادۂ تاریخ' کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہونے کے سبب سنہ میں شک کی گنجایش نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہ بھی درست ہے کہ بہت سی تاریخیں واقعہ رونما ہونے کے بہت برسوں بعد بھی کہی گئی ہیں لیکن ایسی مثالیں کم ہیں۔

عربی میں 'الف' سے 'ی' تک تمام حروف کے اعداد متعین ہیں۔ اس کے سبھی حروف کو آٹھ کلمات ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ اور ضظغ کے نام سے منظم کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ چوں کہ ابجد ہے، اس لیے اسے 'حساب ابجدی' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 'حساب ابجدی' کا دوسرا نام 'حساب جمل' بھی ہے۔ مذکورہ آٹھ کلموں میں عربی حروفِ تہجی کے سبھی اٹھائیس حروف شامل ہیں۔ ان کے اعداد متعین کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شروع کے نو حروف (ا ب ج د ہ و ز ح ط) میں نو اکائیاں (ا سے ۹ تک)، ان کے بعد کے حروف (ی ک ل م ن س ع ف ص) میں نو دہائیاں (۱۰ سے ۹۰ تک) پھر باقی حروف (ق ر ش ت ث خ ذ ض ظ) میں ایک سو سے ۹ سو تک (۱۰۰ سے ۹۰۰ تک) اور آخری حرف 'غ' کے لیے ہزار (۱۰۰۰) کے اعداد ڈالنے سے تمام حروفِ تہجی کے اعداد حاصل ہوجائیں گے۔

اردو اور فارسی کے وہ حروف جو عربی میں نہیں ہیں، ان کے اعداد متعین کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عربی کے ملتے جلتے حروف (قریب المخرج) سے بدل دیے جاتے ہیں۔ مثلاً پ = ب، ٹ = ت، چ = ج، ڈ = د، ڑ = ر، ژ = ز اور گ = ک۔

قطعۂ تاریخ کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر 'مادۂ تاریخ' مکمل ہو یہ ضروری نہیں۔ شاعر مادّے سے دو کام لیتا ہے ایک واقعے کے اہم اشارے بیان کرنے کا اور دوسرا اس کے اعداد سے واقعے کا سال ظاہر کرنے کا۔ اس لیے بسا اوقات ایسا مادّہ حاصل ہوجاتا ہے جو ہر لحاظ سے مناسب ہو لیکن اس کے کچھ اعداد بڑھ یا گھٹ جانے کی صورت میں بھی شاعر مادّہ تو وہی رکھ لیتا ہے مگر اسی شعر میں یہ اشارہ کردیتا ہے کہ کتنے عدد کا اضافہ کرنا ہے یا حذف کرنا ہے۔ اسی اضافہ کرنے کو شعری اصطلاح میں 'تعمیہ' اور حذف کرنے کو 'تخرجہ' کہتے ہیں۔

عطا کاکوی

م سید شاہ عطاالرحمان ہے۔ 17 ستمبر 1904 کو وہ مردم خیز گانو کاکو میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ
وہ شعبۂ اردو و فارسی، بہار یونی ورسٹی مظفر پور اور شعبۂ فارسی، پٹنہ یونی ورسٹی سے بہ حیثیت
ا و فارسی کے ڈائرکٹر ہوئے اور صدرِ جمہوریہ کے سرٹی فیکٹ آف آنر سے سرفراز کیے گئے۔
زی دور کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ 8 مارچ 1998 کو پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔
ب کے رمز شناس مانے گئے۔ تنقید، تحقیق، شاعری، تاریخ نویسی جیسی اصناف پر انھوں نے
طالعۂ حسرت'، 'تنقیدی مطالعے' اور 'تقابلی مطالعے' ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ 'جمالِ غزل'،
رِ غالب'، 'ساقی نامہ' ان کی شعری تصانیف ہیں۔ 'تحقیقی مطالعے' کے نام سے ان کے 19
تحقیقی مضامین کا ایک انتخاب 1965 میں شائع ہوا۔ 10 غزل گو شاعروں کا انتخاب 'میخانۂ تغزل' کے نام سے شائع کیا۔ مرزا عبدالقادر بیدل کی حیات اور خدمات پر ان کی کتاب 'حیرتِ زار' اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے رسالہ 'سفینہ' بھی جاری کیا جس کے متعدد خصوصی شمارے دستاویزی اہمیت کے حامل قرار پائے۔

عطا کاکوی کی ایک حیثیت تاریخ گو کی بھی ہے۔ انھوں نے ایک طویل مدت تک شاعروں، ادیبوں یا اپنے زمانے کی معتبر شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر متعدد تاریخیں کہیں جو ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ قدیم ادب پر ان کی ماہرانہ دست رس تھی اور اردو فارسی کے کلاسیکی سرمائے کے وہ گہرے واقف کار تھے۔ اس لیے انھوں نے تاریخ گوئی میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ عظیم آباد کی محفلوں میں وہ باقیات الصالحات کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد کلاسیکی اقدارِ ادب کا کوئی دوسرا نکتہ داں سامنے نہیں آیا۔

عطا کاکوی

قطعۂ تاریخ

غمِ ارشدؔ

یہ واقعہ ہے کہ ارشد کی موت سے اے دوست
کھلا دریچۂ غم در ہوا خوشی کا بند
ابھی جوان تھا چونتیس سال کی تھی عمر
ہوئی نہ جانے ادا کون سی قضا کو پسند
مثالِ شمع جو بزمِ ادب میں روشن تھا
ہوئی ہوائے اجل سے زبان اس کی بند
کھلا دریچہ قضا کا تو کر گئی پرواز
تھی روح جسم میں جیسے قفس میں طائر بند
کسی سے رو نہ رعایت نہ تھا کسی سے عناد
سخی تھا گو بڑا اپنی وضع کا پابند
صاف [illegible] مرگ است کس نمی داند
[illegible] روح [illegible] کجا پروند
وہ [illegible] از کجا آرم
حیات [illegible] دل ما بیند
[illegible] احباب بھی خدا نہ دکھائے
[illegible] دشمن کو خدا کرے یہ گزند
بھلا [illegible] جہاں میں قائم
یہ [illegible] دل [illegible] دو فرزند
وہ [illegible] رحلت کی
[illegible] مرحوم [illegible] سال [illegible] فرزند
[illegible] ۱۳۸۱+۱=۱۳۸۲ھ

لفظ و معنی

دریچہ	۔	کھڑکی
قضا	۔	موت، تقدیر
اجل	۔	موت
قفس	۔	پنجرہ، جال، پھندہ
طائر	۔	چڑیا، پرندہ
روزعایت	۔	طرف داری
عناد	۔	دشمنی، لڑائی
وضع	۔	طرز، روش، طریقہ
الم	۔	رنج، غم، دکھ
گزند	۔	صدمہ، نقصان
یادگار	۔	نشانی، علامت
مرحوم	۔	مرا ہوا، رحم کیا گیا
فرزند	۔	بیٹا
رحلت	۔	موت، کوچ، روانگی

فارسی مصرعوں کے معنی

حیات چیست؟ چہ مرگ است کس نمی داند — حیات کیا ہے، موت کسے کہتے ہیں، کوئی نہیں جانتا

ازیں دیارِ فنا روحِ او کجا بردند — اس فانی دنیا سے اس کی روح کو کہاں لے گئے

کجا رَوَم، چہ کنم، صبر از کجا آرم — کہاں جاؤں، کیا کروں، صبر کہاں سے لاؤں

خبر کنید بہ احباب حالِ ما بینند — دوستوں کو خبر کرو کہ ہمارا حال دیکھیں

آپ نے پڑھا

- 'غمِ ارشد' عطا کاکوی کا ایسا قطعۂ تاریخ ہے، جو انھوں نے اپنے جواں سال بیٹے ارشد کاکوی کی موت پر لکھا ہے۔ آخری شعر کے علاوہ سبھی اشعار میں مرحوم کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ آخری شعر کے ثانی مصرعے میں سالِ وفات ظاہر کیا گیا ہے۔
- قطعۂ تاریخ میں عام طور سے مکمل مصرعے کے اعداد سے تاریخ برآمد کی جاتی ہے۔ یہاں شاعر نے مصرعے کے ایک ٹکڑے

کہکشاں : حصہ دوم

'غمِ فرزند' سے تاریخ نکالی ہے۔ چونکہ 'غمِ فرزند' سے 1381ھ برآمد ہوتے ہیں اور ارشد کا کوی کی موت 1382ھ میں واقع ہوئی، اس لیے شاعر نے 'تعمیہ' سے کام لیا۔

- سرِ الم کو ملا کر کہا غمِ فرزند'۔ 'سرِ الم' یعنی لفظ الم کا سر 'الف' 'غمِ فرزند' میں ملانے کا اشارہ دے کر شاعر نے 'الف' کے ایک عدد کو 'غمِ فرزند' کے اعداد 1381ھ میں داخل کر کے 1382ھ تاریخ نکالی ہے۔ کسی مصرعے، فقرے یا جملے میں کوئی عدد بڑھانے کے اسی عمل کو 'تعمیہ' کہتے ہیں۔
- تعمیہ کا استعمال کرتے ہوئے اگر شاعر کسی لفظ کے 'سر' کو ملانے کی بات کہتا ہے تو اس کی مراد لفظ کے پہلے حرف سے ہوتی ہے۔ جیسے 'سرِ الم' میں الم کا الف۔ یہی اگر 'پائے الم' کہا جاتا تو لفظ الم کا پیر یعنی 'م' مراد ہوتی۔ اسی طرح اگر 'الم' کی کمر کا اشارہ ہو تو شاعر کی مراد حرف 'ل' سے ہوگی۔

قطعۂ تاریخِ رحلت جناب اشرف قادری

ثبت ہے مخلوق پہ مہرِ الیہ ترجعون
موت کی بنیاد پر ہے زندگی کی چھت بنی

ساعیِ جمہور اشرف، شاعر و قانون داں
کیا معمّر ذات تھی جو قبر کی زینت بنی

موت سے کس کو مفر ہو، تاجور ہوں یا گدا
جب شہِ لولاک کی بھی ظاہراً تربت بنی

'کہیے اشرف قادری ہم سایۂ قادر بنے' = ۱۴۱۹ھ
غوث کی نسبت وہاں بھی باعثِ رحمت بنی

قریۂ افکار میں مُلہم لگاتا ہے صدا
'کہہ سکونت گاہِ اشرف قادری جنت بنی' = ۱۹۹۸ء

لفظ و معنی

ثبت — نقش
مخلوق — پیدا کیا ہوا، دنیا
الیہ ترجعون — اس کی طرف تمھیں پلٹنا ہے (سورہ یٰسین، آیت :۲۲)
ساعیِ جمہور — قوم یا عوام کے لیے کوشش کرنے والا (مراد: مجاہد آزادی)
معمّر — بزرگ، بوڑھا
مفر — بھاگنے کی جگہ، بچاؤ، چھٹکارا
تاجور — بادشاہ، تاج والا
شہِ لولاک — مراد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کہکشاں : حصہ دوم

تربت	-	مزار، قبر
غوث	-	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا لقب
باعثِ رحمت	-	رحمت کا سبب
قریہ	-	گانو
افکار	-	خیالات (فکر کی جمع)
مُلہم	-	دل میں غیب سے بات ڈالنے والا
سکونت گاہ	-	ٹھہرنے کی جگہ، قیام گاہ

آپ نے پڑھا

- واحد نظیر نے یہ قطعۂ تاریخ اشرف قادری کی وفات پر لکھا ہے۔ زندگی کی چھت موت کی بنیاد پر مبنی ہے، اس فلسفے کو بیان کرنے کے لیے بہ طورِ دلیل قرآن کی آیت کا ٹکڑا شعر میں باندھا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں موت کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ پیغمبر، بادشاہ اور فقیر جو بھی ذی روح ہے، اسے موت کا مزہ چکھنا ہے۔
- اس قطعہ میں شاعر نے مرحوم کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان کی حیات کے مختلف پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ایک مصرع 'ساعیِ جمہور اشرف' شاعر و قانون داں، میں مرحوم کی تین خصوصیات بیان کردی گئی ہیں کہ وہ مجاہد آزادی بھی تھے، شاعر بھی اور قانون داں (وکیل) بھی۔ اسی طرح ہجری مادّۂ تاریخ 'کہیے اشرف قادری ہم سایۂ قادر بنے' =۱۴۱۹ھ میں ان کے سلسلے کی طرف اشارہ ہے۔
- ایسے قطعاتِ تاریخ کے نمونے اردو شاعری میں موجود ہیں، جن کے سبھی مصرعوں سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس قطعہ میں واحد نظیر نے دو مصرعوں سے تاریخ برآمد کی ہے۔ چوتھے شعر کے اولیٰ مصرعے سے ہجری سال اور آخری شعر کے ثانی مصرعے سے عیسوی سال۔ یہاں دونوں تاریخی مادّے مکمل مصرع کی شکل میں ہیں، اس لیے تعمیہ یا تخرجہ کا استعمال نہیں ہوا ہے۔

واحد نظیر

قطعۂ تاریخ مسند نشینی امیرِ شریعت مولانا نظام الدین صاحب

کس نے دستارِ امیری سر پہ باندھی ہے نظیر
آج جب کہ ملک میں حالات یوں سنگین ہیں

رقص کرتے ہیں مولے کثرتوں کے زعم میں
پر سمیٹے پتھروں کے درمیاں شاہین ہیں

کررہے ہیں تیرگی کو نور سے تعبیر سب
عالموں میں جہل والے باعثِ تزئین ہیں

پُرفتن ماحول میں بے شک نظام الدین آپ
غم زدوں کے واسطے مینارۂ تسکین ہیں

قوم و ملّت کے لیے ہیں باعثِ صد افتخار
'شانِ اولوالامرِ منکم کیا نظام الدّین ہیں'

لفظ و معنی

دستارِ امیری	-	سرداری کی پگڑی (قیادت کی ذمّے داری)
رقص	-	ناچ، اچھلنا، کودنا
مولے	-	ایک چھوٹا سا پرندہ، جھانپو
زعم	-	غرور، گمان
شاہین	-	ایک مشہور شکاری پرندہ
تیرگی	-	اندھیرا، سیاہی
تعبیر	-	بیان کرنا، توضیح
جَہل	-	نادانی، بے علمی
باعثِ تزئین	-	آرایش کی وجہ، زیب و زینت کا سبب

پُرفتن - فتنوں سے بھرا ہوا

مینارۂ تسکین - تسلّی کا ستون، ڈھارس کی علامت

صدافتخار - بہت زیادہ فخر کرنے کے لائق

اولوالامر منکم - ان کا جو تم میں حکومت کرنے والے ہیں (سورہ النساء، آیت:۵۹)

آپ نے پڑھا

- آپ تعارف میں پڑھ چکے ہیں کہ کسی بھی اہم موقعے سے قطعۂ تاریخ کہنے کی روایت اردو ادب میں موجود رہی ہے۔ واحد نظیر کا یہ قطعۂ تاریخ مولانا نظام الدین کے امیرِ شریعت بننے کے موقعے سے کہا گیا ہے۔ کسی بھی قطعۂ تاریخ سے جہاں ہمیں واقعے کا سال معلوم ہوتا ہے، وہیں اس واقعے سے متعلق کئی دوسری تفصیلات بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔
- اس قطعۂ تاریخ میں شاعر نے پہلے بیسویں صدی کے عمومی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ خصوصاً تہذیبی اور اخلاقی گراوٹوں کی طرف طنزیہ انداز میں بہت ہی خوبصورت اشارے کیے ہیں۔ اس تمہید کے بعد مولانا نظام الدین کے امیرِ شریعت بننے کو امید کی کرن سے تعبیر کیا ہے۔
- اس قطعہ کے مادۂ تاریخ میں ایک قرآنی آیت کے ٹکڑے کا استعمال ہوا ہے۔ کبھی کبھی یہ اتفاق بھی ہوتا ہے کہ کسی اہم واقعے کے عین مطابق کوئی قرآنی آیت ایسی مل جاتی ہے جس کے اعداد بھی متعلقہ سال کے برابر ہوتے ہیں۔
- واحد نظیر کا اصل نام عبدالواحد ہے۔ 12 اپریل 1968 کو گریڈیہہ ضلع (موجودہ جھارکھنڈ) میں پیدا ہوئے۔ گذشتہ پچیس برسوں سے عظیم آباد میں مقیم ہیں۔ شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی سے گولڈ میڈلسٹ ہیں اور 'عتیق اللہ کی ادبی خدمات' کے موضوع پر انھوں نے مقالۂ تحقیقی تیار کیا۔ 2003 میں ان کی تحقیقی کتاب 'اسلحے، سکّے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات: تحقیق و تجزیہ' منظرِ عام پر آئی۔ 2007 میں 'رونق اور کلامِ رونق' اور 'جہانِ نادیدہ' کتابیں شائع ہوئیں۔ واحد نظیر ایک ساتھ شاعر، محقق اور نقاد ہیں اور فارسی، عربی اور اردو زبانوں کے علمی سرمائے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ گوئی میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ نئی نسل کے لوگوں میں شاید ہی کوئی دوسرا ملے جسے اس قدیم فن سے اتنی گہری دل چسپی ہو۔

آپ بتائیے

1. 'باغ و بہار' کے اعداد بتائیے۔
2. 'محمدؐ' کے اعداد بتائیے۔
3. 'ظ' کس تعداد کے برابر ہے؟
4. 'ارشد' کس عدد کے برابر ہے؟
5. 'اشرف قادری' کس عدد کے برابر ہے؟

مختصر گفتگو

قطعہ ۱

1. عطا کاکوی نے قطعۂ تاریخ 'غمِ ارشد' کس کی موت پر لکھا؟
2. ارشد کاکوی اور عطا کاکوی میں کیا رشتہ تھا؟
3. جب ارشد کاکوی کی وفات ہوئی تو وہ کتنے سال کے تھے؟
4. 'غمِ ارشد' میں ارشد کاکوی کے دو بیٹوں کا بھی ذکر ہے۔ دونوں کے نام بتایئے۔
5. شاعر نے 'سرِ الم' ملا کر کتنے عدد کا اضافہ کیا؟

قطعہ ۲

1. اشرف قادری کی رحلت کس سال ہوئی؟
2. واحد نظیر نے اس قطعۂ تاریخ میں مرحوم کی کن تین خوبیوں کا ذکر کیا ہے؟
3. 'قادری' سے کس بزرگ کی نسبت ظاہر ہوتی ہے؟
4. 'قانون داں' کو عرف عام میں کیا کہتے ہیں؟

قطعہ ۳

1. مولانا نظام الدین سے متعلق قطعۂ تاریخ کس موقعے سے کہا گیا؟
2. اس قطعۂ تاریخ کے شاعر کا نام بتایئے۔
3. مولانا نظام الدین کس سال امیرِ شریعت منتخب ہوئے؟
4. 'مینارۂ تسکین' سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. تاریخ گوئی سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. تاریخ گوئی کی ادبی اور تاریخی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. قطعۂ تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے شاملِ نصاب کسی ایک قطعہ کا جائزہ لیجیے۔
4. عطا کاکوی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔
5. واحد نظیر کے قطعاتِ تاریخ کا عمومی جائزہ لیجیے۔
6. قطعاتِ تاریخ میں تخرجہ کا استعمال کب ہوتا ہے؟
7. تعمیہ کسے کہتے ہیں؟
8. مادۂ تاریخ کسے کہتے ہیں؟

آیئے، کچھ کریں

نصاب میں شامل قطعاتِ تاریخ کے درج ذیل مادّوں کے اعداد نکالیں۔

مثال کے طور پر ایک مصرعے سے اعداد نکال کر درج کر دیا گیا ہے۔ آپ بھی اسی طرح کیجیے:

سرِ الم کو ملا کر کہا غمِ فرزند
کہیے اشرف قادری ہم سایۂ قادر بنے
کہہ سکونت گاہِ اشرف قادری جنت بنی
شانِ اولوالامرِ منکم کیا نظام الدّین ہیں

اَبجد	ا	ب	ج	د
	۱	۲	۳	۴
ہَوَّز	ہ	و	ز	
	۵	۶	۷	
حُطِّی	ح	ط	ی	
	۸	۹	۱۰	
کَلَمَن	ک	ل	م	ن
	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰
سَعفَص	س	ع	ف	ص
	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰
قَرَشَت	ق	ر	ش	ت
	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰
ثَخَّذ	ث	خ	ذ	
	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	
ضَظَّغ	ض	ظ	غ	
	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰	

1. پیش کردہ جَدول میں سبھی حروف کے اعداد درج ہیں، انھیں ذہن نشیں کرنے کی کوشش کیجیے۔

مثال

کہہ	ک	۲۰
	ہ	۵
سکونت	س	۶۰
	ک	۲۰
	و	۶
	ن	۵۰
	ت	۴۰۰
گاہِ	گ	۲۰
	ا	۱
	ہ	۵
اشرف	ا	۱
	ش	۳۰۰
	ر	۲۰۰
	ف	۸۰
قادری	ق	۱۰۰
	ا	۱
	د	۴
	ر	۲۰۰
	ی	۱۰
جنت	ج	۳
	ن	۵۰
	ت	۴۰۰
بنی	ب	۲
	ن	۵۰
	ی	۱۰
		۱۹۹۸ء

مرثیہ

مرثیہ اظہارِ غم کے لیے مخصوص ہے۔ مشرقی شاعری میں ایسی نظم کو مرثیہ کہا جاتا تھا جو کسی کی موت پر کہی جائے۔ عربی، فارسی شاعری میں اس کا یہی طور رہا لیکن اردو میں اب شہادتِ امام حسینؓ اور اصحابِ اہلِ بیت کے مصائب کو شعر میں قلم بند کرنے کا نام مرثیہ ہے۔ گذشتہ پانچ صدیوں سے اردو مرثیہ گوئی کا یہی مخصوص موضوع رہا ہے۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کی موت پر لکھی گئی نظم کو اب 'شخصی مرثیہ' کہا جاتا ہے۔

دکن میں سولھویں صدی کے آغاز سے مراثی ملنے لگتے ہیں۔ سید شاہ اشرف بیابانی کی مثنوی 'نوسرہار' (1503) کو عام طور پر اردو کا پہلا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ شاہ میراں جی کی وفات پر برہان الدین جانم نے ایک مرثیہ لکھا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی اور نصرتی — تینوں کے دواوین میں مرثیے موجود ہیں۔ مرزا بیجاپوری نے واقعاتِ کربلا کو بنیاد بنا کر مرثیے لکھے اور دکن کے اہم مرثیہ گو کے طور پر تسلیم کیے گئے۔ دہلی میں اٹھارویں صدی کی ابتدا میں متعدد مرثیہ نگار ملتے ہیں لیکن سودا کی اہمیت اس وجہ سے سب سے زیادہ ہے کیوں کہ انھوں نے مراثی کے لیے مسدّس کی ہیئت کا پہلی بار استعمال کیا۔ بعد کے مرثیہ گویوں نے اس ہیئت کو پسند کیا اور تمام مراثی کم و بیش مسدّس کی ہیئت میں ہی گزشتہ 250 برسوں سے لکھے ملتے ہیں۔

مرثیے کے لیے سب سے زرخیز زمین اَودھ کی ثابت ہوئی جہاں ضمیر، دل گیر، میر مستحسن خلیق اور پھر انیس و دبیر نے اس صنف کو ترقی کی انتہائی منزلوں تک پہنچا دیا۔ انیس اور دبیر کی کوششوں سے ہی یہ صنف ملک کے طول و عرض میں پھیلی۔ ان دونوں اساتذہ نے اور اس زمانے کے نوابین نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو مستقل اہمیت کا حامل بنا دیا۔ بیسویں صدی کے شعرا میں شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نجم آفندی، ہلال نقوی اور آلِ رضا جیسے شعرا نے مرثیوں کی طرف توجہ کی لیکن اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ مرثیے کو سب سے زیادہ لکھنؤ کی فضا ہی راس آئی۔ مرثیے کی شاعری میں رزم اور بزم دونوں کے واقعات ملتے ہیں۔ واقعہ طرازی میں مرثیہ گویوں نے فنی ہنر کا مظاہرہ کیا۔ غم کے بیان میں اور اصحابِ بیت کی مصیبتوں کی تفصیل بتانے میں مرثیہ گو شعرا نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا۔

BSTBPC-2018

میر انیس

میر ببر علی انیس تقریباً 1802 میں محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے جو شہر فیض آباد (اتر پردیش) میں واقع ہے۔ انیس خاندانی شاعر تھے۔ ان کے والد میر مستحسن خلیق، دادا میر غلام حسین حسن اور پردادا میر غلام حسین ضاحک سبھی مشہور شاعر ہوئے۔

خاندانی روایت کے مطابق انیس کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدا میں ان کی والدہ نے انھیں پڑھایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مولوی میر نجف علی فیض آبادی، مولانا حیدر علی اور مفتی محمد عباس سے بھی کسبِ فیض کیا۔ فیض آباد میں انھوں نے سواری اور شمشیر زنی سیکھی اور لکھنؤ میں باقاعدہ فوجی تربیت حاصل کی۔

انیس کے گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا غزل سے کی لیکن اپنے والد کے مشورے پر 'سلام' کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں ان کا تخلص حزیں تھا لیکن ناسخ کے مشورے پر انیس تخلص اختیار کیا۔

انیس نے کثیر تعداد میں سلام اور رباعیاں کہیں لیکن وہ مرثیہ گو کی حیثیت سے ہی عوام و خواص میں مشہور ہوئے۔ لکھنؤ میں جب انیس نے مرثیہ خوانی شروع کی تو انھیں دبیر جیسے مسلم الثبوت استاد کا حریف بننا پڑا۔ ابتدا میں ان کی بہت مخالفت ہوئی لیکن وقت کے ساتھ انیس کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور ان کا نام ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ انیس زندگی بھر کسی دربار سے منسلک نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے کبھی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ لکھا۔ انھیں لکھنؤ سے جو ملتا تھا، اسی پر قانع رہتے تھے۔ 1857 کی تباہی کے بعد انھوں نے لکھنؤ سے باہر نکل کر مجلسیں پڑھیں۔ انھوں نے پٹنہ، حیدر آباد، بنارس اور الہ آباد میں اپنا کلام سنایا۔

انیس کے مرثیوں کی زبان بہ طورِ خاص قابلِ توجہ ہے جن میں محاوروں اور لکھنوی بول چال کے روز مرون کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ انھوں نے کربلا کی الم ناک داستان کو اردو ادب کا بیش بہا جزو بنا دیا۔ رثائی شاعری انیس کی بدولت ہی قابلِ رشک بلندیوں سے ہم کنار ہوئی۔ 10 دسمبر 1874 کو لکھنؤ میں انیس کا وصال ہوا۔

مرثیہ

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر — اے ابرِ کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے، توجہ کوئی دم کر — گم نام کو، اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک، مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن، میرے قلم رَو سے نہ جائے

اس باغ میں، چشمے ہیں ترے فیض کے جاری — بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل بَرومند ہے، یا حضرتِ باری! — پھل ہم کو بھی مل جائے، ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت، چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو، جن پھولوں کی بو کو

تعریف میں چشمے کو، سمندر سے ملادوں — قطرے کو جو دوں آب، تو گوہر سے ملادوں
ذرّے کی چمک، مہرِ منوّر سے ملادوں — خاروں کو نزاکت میں، گلِ تر سے ملادوں

گل دستۂ معنی کو، نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو، تو سو رنگ سے باندھوں

گر بزم کی جانب ہو توجہ، دمِ تحریر — کھنچ جائے ابھی، گلشنِ فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبتِ انجم، فلکِ پیر — ہوجائے ہوا، بزمِ سلیماں کی بھی توقیر

یوں، تختِ حسینانِ معانی اتر آئے
ہر چشم کو، پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

تائید کا ہنگام ہے، یا حیدرِ صف در! — امداد ترا کام ہے، یا حیدرِ صف در!
تو صاحبِ اکرام ہے، یا حیدرِ صف در! — تیرا ہی کرم عام ہے، یا حیدرِ صف در!

تنہا ترے اقبال سے، شمشیر بکف ہوں
سب ایک طرف جمع ہیں، میں ایک طرف ہوں

ناقدریِ عالم کی شکایت نہیں مولا! — کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا!
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا! — میں کیا ہوں، کسی روح کو راحت نہیں مولا!

عالم ہے مکدّر، کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

نیک و بدِ عالم میں، تامّل نہیں کرتے — عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے
خاروں کے لیے، رخ طرفِ گل نہیں کرتے — تعریفِ خوش الحانیِ بلبل نہیں کرتے

خاموش ہیں، گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

الماس سے بہتر، یہ سمجھتے ہیں خذف کو — دُر کو تو گھٹاتے ہیں، بڑھاتے ہیں صدف کو
اندھیر یہ ہے، چاند بتاتے ہیں کلف کو — کھودیتے ہیں، شیشے کے لیے، دُرِ نجف کو

ضائع ہیں دُر و لعل، بدخشان و عدن کے
مٹّی میں ملاتے ہیں، جواہر کو سخن کے

کیا ہوگئے، وہ جوہریانِ سخن اک بار؟ — ہر وقت، جو اس جنس کے رہتے تھے طلب گار
اب ہے کوئی طالب، نہ شناسا، نہ خریدار — ہے کون؟ دکھائیں کسے یہ گوہرِ شہ وار

کس وقت یہاں چھوڑ کے ملکِ عدم آئے
جب اٹھ گئے بازار سے گاہک، تو ہم آئے

خواہاں نہیں یاقوتِ سخن کا کوئی، گو آج — ہے آپ کی سرکار تو یا صاحبِ معراج!
اے باعثِ ایجادِ جہاں، خلق کے سرتاج! — ہوجائے گا دم بھر میں غنی، بندۂ محتاج

امّید اسی گھر کی، وسیلہ اسی گھر کا
دولت یہی میری، یہی توشہ ہے سفر کا

تھا جوش کچھ ایسا ہی، جو دعوا کیا میں نے — خود سر بہ گریباں ہوں کہ یہ کیا کیا میں نے
اک قطرۂ ناچیز کو، دریا کیا میں نے — تقصیر بحل کیجیے، بے جا کیا میں نے

ہاں! سچ ہے کہ اتنی بھی تعلّی نہ روا تھی
مولا! یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی

مجرم ہوں، کبھی ایسی خطا کی نہیں میں نے — بھولے سے بھی، آپ اپنی ثنا کی نہیں میں نے
دل سے، کبھی مدحِ اُمرا، کی نہیں میں نے — تقلیدِ کلامِ جُہلا، کی نہیں میں نے

نازاں ہوں، محبت پہ امامِ ازلی کی
ساری یہ تعلّی ہے، حمایت پہ علی کی

لفظ و معنی

گلزارِارم	-	جنت کا باغ
ابر	-	بادل
زراعت	-	کھیتی
مبدا	-	سرچشمہ
اعجازبیان	-	جادوبیان، نہایت فصیح البیان
رقم کرنا	-	لکھنا، تحریر کرنا
مہر	-	سورج
پرتو	-	روشنی، عکس، پرچھائیں
اقلیم	-	ملک، ولایت
قلم رو	-	سلطنت، حکومت
نخل	-	درخت
برومند	-	پھل دار، کامیاب
یاحضرتِ باری	-	اے پیدا کرنے والے، اے اللہ
ریاضت	-	محنت، مشقت
طبع	-	طبیعت، فطرت
نکو	-	خوب، اچھا
آب	-	چمک
مہرمنور	-	روشن آفتاب
گلِ تر	-	تازہ پھول
دمِ تحریر	-	لکھنے کے وقت
انجم	-	ستارا
فلکِ پیر	-	بوڑھا آسمان
ہوا ہونا	-	فنا ہونا، غائب ہونا
توقیت	-	عزت

پریوں کا اکھاڑا - معشوقوں کی تفریح اوران کے اکٹھا ہونے کا مقام

ناپید - حمایت، طرف داری

ہنگام - وقت

صفدر - صف شکن

شمشیر بکف ہونا - ہاتھوں میں تلوار لینا، لڑنے کو تیار ہونا

دفتر - حساب کتاب کے کاغذ، کچہری کے کاغذات

باطل - غلط، بے اصل

مکدّر - گدلا، میلا

تامل - غور وفکر

عارف - پہچاننے والا، ولی

تجاہل - جان بوجھ کر انجان بننا

خوش الحانی - اچھی آواز، خوش کلامی

الماس - ہیرا

حذف - ٹھیکرا

صدف - سیپ

دُر - موتی

کلف - سیاہ دھبا

دُرِ نجف - شہر نجف کا موتی

جنس - سامان، چیز

طالب - چاہنے والا، مشتاق

شناسا - پہچانا ہوا، پرکھا ہوا

گوہرِ شہ وار - بادشاہوں کے لائق موتی

مُلکِ عدم - عاقبت، وہ عالم جس میں مرنے کے بعد روح رہتی ہے

خواہاں - چاہنے والا، خواہش مند

یاقوت - لعل، ایک قیمتی پتھر

باعثِ ایجادِ جہاں - دنیا کے وجود میں لانے کا سبب

سرتاج	-	آقا، ملک
خلق	-	دنیا کے لوگ، مخلوق
غنی	-	دولت مند
توشہ	-	زادِراہ
سربہ گریباں	-	نام، شرمندہ
تقصیر	-	قصور، کوتاہی
بحل	-	معاف
تعلّی	-	شیخی، ڈینگ، خود سے بڑا بننا
روا	-	جائز
ثنا	-	تعریف
مدح	-	تعریف
جہلا	-	جاہل کی جمع
امامِ ازلی	-	جن کی امامت ازل سے ہے
ازل	-	مخلوق کی پیدائش کا دن، وہ زمانہ جس کی کوئی ابتدا نہ ہو

آپ نے پڑھا

- ابھی آپ نے انیس کے مشہور مرثیے 'یارب! چمن نظم کو گلزارِ ارم کر' کا انتخاب پڑھا۔ یہ 'چہرہ' سے شروع ہو رہا ہے۔ مرثیے کی جو تعریف آپ نے پڑھی ہوگی۔ اس کے لحاظ سے 'چہرہ' تمہیدی حصہ ہے۔ مرثیے کے مرکزی جزو تک لے جانے کے لیے یہاں فضا بندی ہوتی ہے۔ ابتدائی دو بند میں آپ نے دیکھا کہ شاعر خدا کی تعریف کر رہا ہے اور اپنے مرثیے میں 'قلم کا جادو' دکھانے کے لیے خدا سے گزارش بھی کر رہا ہے۔
- انیس کی فنِ مرثیہ پر گرفت کیسی ہے اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں جس اندازِ بیان کو روا رکھا، اس کے لیے انیس ہی کا شاملِ نصاب مرثیے کا تیسرا بند پیش کیا جا تا رہا ہے۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملادوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملادوں
ذرے کی چمک مہرِ منوّر سے ملادوں — خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملادوں
گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

- اب ہم لوگ درجِ بالا بند پر غور کرتے ہیں۔ ابتدائی چار مصرعوں میں آپ دیکھیں گے کہ انیس کسی بات کو اس کی اصل صورت میں

نہیں کہنا چاہتے کہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر کہنا ان کا شعری ایمان ہے۔ آخر کے دو مصرعوں میں واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سیکڑوں طریقوں سے باندھ سکتے ہیں۔ یہاں ان کی رعایتِ لفظی بھی قابلِ توجہ ہے۔ پھول کی مناسبت سے رنگ اور گل دستہ جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ آپ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر جب اس مرثیے کا مطالعہ کریں گے تو لفظوں کے طلسم سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ انیس کے کلام میں موجود بلاغت کے دوسرے پہلوؤں پر بھی توجہ کر سکیں گے۔ ساتھ ہی اس کی معنوی گہرائی بھی آپ پر بڑی آسانی سے کھل جائے گی۔

آپ بتائیے

1. میر انیس کا پورا نام کیا ہے؟
2. مرثیے کی تمہید کو کیا کہتے ہیں؟
3. میر انیس کے ایک ہم عصر کا نام بتائیے۔
4. اردو کے پہلے مرثیے کا نام کیا ہے؟
5. 'مرثیہ' کس لفظ سے مشتق ہے؟
6. انیس کا تعلق کس دبستان سے ہے؟
7. انیس کے اسلاف میں کس مثنوی نگار کا نام آتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. مرثیے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟
2. انیس مرثیے میں کس طرزِ تحریر سے کام لینا چاہتے ہیں؟
3. 'اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے'
   انیس درج بالا مصرع کیوں رقم کرتے ہیں؟ اپنے سبق کے حوالے سے جواب دیں۔
4. مصرعوں میں لفظوں کی ترتیب درست کیجیے:
   ا۔ سو رنگ کا مضموں ہو، تو اک پھول سے باندھوں
   ۲۔ چمنِ نظم کو یارب گلزار ارم کر
   ۳۔ سب کچھ ہے پر انصاف اس عہد میں نہیں ہے

تفصیلی گفتگو

1. 'انیس فنِ مرثیہ کی معراج ہیں۔' اس قول کے قبول یا رد میں دلیلیں دیجیے۔
2. مذہبی عنصر کی شمولیت کے باوجود صنفِ مرثیہ کا زوال کیوں ہوا؟

3. انیس کی منظر نگاری پر ایک مضمون لکھیے

4. تشریح کیجیے:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

- جملے بنا کر جنسیت ظاہر کیجیے۔

چمن، چشمہ، سمندر، بلبل، چمن، مٹی، آب وہوا، جوش، شمشیر

- نیچے دیے گئے الفاظ کے دو دو مترادف الفاظ لکھیے۔

رب، پھل، شمشیر، عنایت، فلک

- واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے

صاحب، عام، اطراف، روح، حکام، علما، خلق، تصاویر، حال

آیئے، کچھ کریں

1. میر انیس کے اسلاف میں کئی شاعر ایک سلسلے سے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق اطلاعات حاصل کیجیے۔
2. اردو کے مرثیہ گو شعرا کی ایک فہرست بنایئے اور ان کے اہم مراثی جمع کیجیے۔

مزید مطالعے کے لیے

خودنوشت [186-194]

• میں یونی ورسٹی میں — احسان دانش — 188

داستان [195-200]

• فسانۂ عجائب — مرزا رجب علی بیگ سرور — 196

افسانہ [201-213]

• کوارنٹین — راجندر سنگھ بیدی — 202

خطبہ [214-219]

• کامل انقلاب — جے پرکاش نارائن — 214

نظم [220-229]

• شکستِ زنداں کا خواب — جوش ملیح آبادی — 221

• آوارہ — اسرار الحق مجاز — 225

غزل [230-239]

• اگر باہر اپس کے گھر سوں موہن یک قدم نکلے — ولی دکنی — 231

• کوچۂ یار عین کاسی ہے — ولی دکنی — 231

• کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینۂ دل ہوتا — راسخ عظیم آبادی — 236

• ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے — راسخ عظیم آبادی — 236

قصیدہ [240-247]

• تضحیکِ روزگار — مرزا محمد رفیع سودا — 242

گیت [248-254]

• ساتھی ہاتھ بڑھانا — ساحر لدھیانوی — 250

• تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا — ساحر لدھیانوی — 251

خودنوشت

خودنوشت یا آپ بیتی، سوانح نگاری کی وہ شکل ہے جس میں لکھنے والا خود اپنے حالات بیان کرتا ہے۔ لکھنے والا محتاط اور ذمّے دار ہے تو خودنوشت کی حیثیت دستاویزی ہوجاتی ہے لیکن اگر لکھنے والے نے اپنے فرائض کا مکمّل خیال نہیں رکھا تو خودنوشت تنازعات میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ سوانح یا حالاتِ زندگی سے متعلق متعدد اصناف، خاکہ، ڈائری، سوانح اور خودنوشت میں، خودنوشت کی اس وجہ سے زیادہ اہمیت ہے کیوں کہ لکھنے والے سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے نہ صرف ظاہری طور پر واقف کرائے گا بلکہ ان اسباب و عوامل پر بھی گفتگو کرے گا جن کی وجہ سے اس کی زندگی کے حالات میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔

خودنوشتیں عام طور پر اہم مصنفین، سیاست داں یا دوسرے شعبے سے متعلق بڑی شخصیات کے قلم سے نکلتی ہیں۔ ایک اچھی خودنوشت میں لکھنے والے کے آباواجداد اور خود اس کی زندگی کے اچھے اور بُرے واقعات کی مکمل تفصیل چاہیے۔ اسی کے ساتھ اپنے زمانے کے اہم حالات اور واقعات یا شخصیات کے بارے میں بھی آپ بیتی لکھنے والے کے تاثرات جاننے کی خواہش ہر پڑھنے والے کو ہوتی ہے۔ یہ توقّع بھی کی جاتی ہے کہ خودنوشت میں ایک ایک بات تحقیق کے ساتھ درج کی جائے اور مصلحت کا کم سے کم دخل ہو ورنہ خودنوشت کا پایۂ اعتبار کمزور ہوجائے گا۔ پڑھنے والے کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ لکھنے والا بے لاگ اور ایمان دار ہو کر اپنا ایسا محاسبہ پیش کرے جس سے پڑھنے والوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ اپنی خوبی اور خامی دونوں کو اپنی زندگی کے آئینے میں صاف صاف اس طرح بتادے کہ پڑھنے والا آپ بیتی لکھنے والے کی زندگی کے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہو سکے۔

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کو جس طرح روشن کیا، اسی طرح اچھی خودنوشت سے توقّع ہوتی ہے کہ لکھنے والا خود کو عام انسانی سطح پر لے آکر صرف سچ کہنے کے لیے اپنا قلم اٹھائے۔ بعض خودنوشتوں میں انسانی دردمندی اور حیات و کائنات کے بارے میں دانش ورانہ اور فلسفیانہ لَے ابھرتی ہے تو اس کے پیچھے یہی وجہ ہوتی ہے کہ لکھنے والے نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری کی آپ بیتی 'کالا پانی' کو اردو کی پہلی خودنوشت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی اشاعت 1923 میں ہوئی تھی۔ حالاں کہ اسے کافی پہلے لکھا جا چکا تھا۔ سرسید علی کی خودنوشت 'اعمال نامہ' کو بھی اردو کی ابتدائی آپ بیتی کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ بعد کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کی خودنوشتیں توجہ کے لائق ثابت ہوئیں۔ شاعروں میں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی 'یادوں کی برات' اختر الایمان کی 'اس آباد خرابے میں'، کلیم عاجز کی 'ابھی سن لو مجھ سے' اور احسان دانش کی 'جہانِ دانش' بہت مشہور ہوئیں۔ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے بھی متعدد خودنوشتیں لکھیں، جن میں قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول 'کارِ جہاں دراز ہے'، قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ' اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ بعض نقادوں نے بھی خودنوشتیں لکھیں —— کلیم الدین احمد کی 'اپنی تلاش میں' آلِ احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں' اور اختر حسین رائے پوری کی 'گردِ راہ'، وہاب اشرفی کی 'قصّہ بے سمت زندگی کا'۔

اردو میں بعض خواتین کی خودنوشتیں بھی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں اور ان کے سلسلے سے علمی حلقوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ ادا جعفری کی 'جو رہی سو بے خبری رہی'، کشور ناہید کی 'بُری عورت کی کتھا'، بیگم حمیدہ اختر کی 'ہم سفر'، عصمت چغتائی کی 'کاغذی ہے پیرہن'، بیگم انیس قدوائی کی 'غبارِ کارواں'، سعیدہ بانو کی 'ڈگر سے ہٹ کر' وغیرہ شہرت کی حامل رہیں۔ رشید احمد صدیقی کی 'آشفتہ بیانی میری' اور مشتاق احمد یوسفی کی 'زرگزشت' بھی الگ طرح کی خودنوشتیں ہیں۔

احسان دانش

اصل نام احسان الحق اور تخلص دانش ہے۔ 1914 میں پیدا ہوئے۔ احسان کے والد قاضی دانش علی قصبہ باغپت ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے خسر ابوعلی شاہ کے وصال کے بعد ترکِ وطن کر کے کاندھلہ چلے آئے۔ احسان دانش اپنی نانہال کاندھلہ میں ہی پیدا ہوئے۔ ہر چند کہ قضا احسان دانش کا جدی طرّۂ امتیاز تھا لیکن قاضی دانش علی تک آتے آتے یہ انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ دانش علی ایک ٹھیکے دار کے پاس مزدوروں کی جماعت میں تھے، کام نہیں رہنے پر بیلچے اور پھاوڑے سے مزدوری بھی کیا کرتے تھے۔

احسان دانش نے صرف چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ عربی و فارسی کاندھلہ کے ایک بزرگ حافظ محمد مصطفیٰ سے سیکھی۔ غربت کی وجہ سے کم عمری میں مزدوری کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے والد کو کتابیں سننے کا شوق تھا۔ لہٰذا احسان دن بھر مزدوری کرنے کے بعد شام کے وقت اپنے والد اور ان کے چند دوستوں کو کتابیں پڑھ کر سناتے، قاضی محمد ذکی کے کتب خانے سے کتابیں آتی تھیں جو احسان کے استاد تھے۔

کاندھلہ میں کچھ دنوں تک مزدوری کرنے کے بعد وہ تلاش معاش میں لاہور آئے اور معماروں کے پاس اینٹ ڈھونے کا کام کرنے لگے۔ دوپہر میں جب مزدور آرام کرتے تو احسان کتابیں پڑھتے۔ رفتہ رفتہ یہ معماری تک پہنچے لیکن بعد میں یہ کام ترک کر دیا۔ انھوں نے رنگ سازی، دفتر کی چوکیداری، فصل کی کٹائی، باغبانی اور کتب فروشی وغیرہ کا کام کیا، بعد میں لاہور کے محلہ مزنگ میں اپنا ذاتی کتب خانہ مکتبۂ دانش کے نام سے قائم کیا۔

شعروشاعری کا ذوق قاضی محمد ذکی کی صحبت میں پیدا ہوا۔ احسان دانش کے دوست توقیر طاہر نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ انھی کی کوششوں سے انھوں نے پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھا اور انھی کی بدولت احسان کا بہت سا کلام ضائع ہونے سے بچ گیا۔ احسان دانش بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور نثر میں بھی لکھا۔ ان کی کچھ اہم تصانیف کے نام یوں ہیں: 'حدیثِ ادب'، 'دردِ زندگی'، 'نفیرِ فطرت'، 'نوائے کارگر'، 'چراغاں'، 'آتشِ خاموش'، 'مقاسات'، 'شیرازہ'، 'جادۂ نو'، 'زخم و مرہم'، 'گورستان'، 'میراثِ مومن'، 'جہانِ دانش'، 'جہانِ دِگر'، 'زنجیرِ بہاراں'۔

مارچ 1982 کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

میں یونی ورسٹی میں

پیسہ اخبار میں رہتے ہوئے ایک معمار محمد اسحاق نامی کی معرفت مستری بدھو سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ نہایت شریف محنتی اور دیانت دار انسان ہونے کے علاوہ ایک مرتاض اور صاحب احتیاج آدمی واقع ہوا تھا، جب بھی اس سے ملاقات ہوتی، نہایت خلوص سے پیش آتا۔

ایک دن وہ ملا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔ 'کہو میاں، کہیں کام کر رہے ہو یا نہیں۔' میں نے کہا: 'دو روز سے خالی ہوں۔' مستری بولا۔ 'دیکھو یونی ورسٹی میں مدد لگی ہوئی ہے اور رہٹ پر ایک مزدور کی ضرورت ہے، بارہ آنے روز ملیں گے۔ اگر جی چاہے تو سویرے ہی میرے ساتھ چلنا۔'

میں نے حامی بھر لی اور کہا: 'میں کل صبح یہیں آپ کا انتظار کروں گا۔' مستری املی والے تکیے میں رہتے تھے جو یونی ورسٹی سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ چلتے ہوئے مستری بدھو نے کہا: 'دیکھو اگر کہیں اور جانا ہے تو ابھی بتا دو تاکہ میں کسی دوسرے آدمی کا انتظام کر لوں۔' میں نے مسکرا کر کہا۔ 'نہیں، میں آپ کا انتظار کروں گا اور ساتھ چلوں گا۔' لیکن میں سوچ رہا تھا کہ رہٹ پر تو صرف بیلوں کو ہانکنے کے لیے آدمی کی ضرورت ہو سکتی ہے اور یہ کام نہایت آسان ہے اس میں کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔ کھائی پر بیٹھے بیٹھے بیلوں ہی کو ہانکنا ہوگا نا؟ اس میں تو مطالعہ کا موقع بھی آسانی سے مل جائے گا۔

دوسرے دن علی الصبح میں مستری بدھو کے ہمراہ یونی ورسٹی پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ یونی ورسٹی ہال کے شمال میں مسجد کے سامنے ایک پیپل کا درخت ہے اور اس کے نیچے ایک کنویں پر ایک گورکھا قسم کا پستہ قد رہٹ لگا ہوا ہے۔ اس کی مال میں ڈولچیاں آویزاں ہیں جن میں قریباً ایک ایک بڑا لوٹا پانی آ جائے لیکن اس میں نہ تو کوئی بیل جوتنے کا جوا ہے نہ الانجن۔ ہاں مال سے نزدیک رہٹ کے دھرے میں ایک آہنی پہیا مرقد نما گہرے گڑھے میں لگا ہوا ہے اور پہیے میں چاروں طرف لوہے کی کھونٹیاں۔ اس گڑھے میں پہیے کو چلا دینے کے لیے اسے اتنا وسیع اور گہرا کر دیا گیا ہے کہ کرسی کی نشست کی طرح ایک آدمی پانو لٹکا کے بیٹھ سکے جیسے جولاہوں کی کارگہہ۔

مستری بدھو نے کہا: 'دیکھو بھائی یہ رہٹ ہے اور یہ لوہے کا پہیا ہاتھوں اور پانو کے زور سے گھمانا ہے اور گھما گھما کر پوری مدد کے لیے پانی دینا ہے۔ یہ نالی یہاں سے بڑے حوض میں جاتی ہے حوض ہر وقت بھرا رہنا چاہیے اس میں اینٹیں بھی بھیگیں گی، گارا، چونا بھی بنے گا اور دیواروں پر بھی چھڑکا جائے گا۔ غرض یہ کہ مدد کو جتنے پانی کی ضرورت ہوگی، اس کے تم ذمے دار ہو گے،

BSTBPC-2010

ابھی اسی کام پر تمھارا ایک ساتھی اور بھی آتا ہوگا جو تمھارے ساتھ رہے گا اور مدد دے گا۔ ایسی ویسی مدد نہیں، وہ تمھارے ساتھ برابر کا کام کرے گا۔'

پہلے تو میں گھبرایا کہ میں یہ بیل کا کام کیسے کروں گا لیکن پھر سوچا کہ آخر دوسرا آدمی بھی تو کام کرے گا، وہ کوئی لوہے کا بنا ہوا تو ہوگا نہیں۔ اس خیال سے ذرا ہمت سی بندھی اور میں مطمئن سا ہو گیا۔

اتنے میں ایک مزدور رتنا نامی آ کر کھڑا ہو گیا۔ مستری نے اس سے کہا: 'یہ آدمی تمھارے ساتھ کام کرے گا، تم شروع کرو یہ نیا آدمی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی بدلتے رہنا۔ رتنا اس مرقد نما گڑھے میں اتر کر اطمینان سے بیٹھ گیا اور پہیے پر لگی ہوئی لوہے کی اوپر والی کھونٹیاں ہاتھ سے کھینچ کھینچ کر اور نیچے والی کھونٹیوں کو پانو سے دھکیل دھکیل کر پہیے کو چکر دینا شروع کر دیا، میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ یہ تو بیل کا کام آدمی سے لیا جاتا ہے۔ میرا حوصلہ ذرا پست ہوا لیکن دوسرے بیل دار کو دیکھ کر ڈھارس بندھی اور میں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں رتنا پسینے میں شرابور ہو کر رہٹ چھوڑ گیا اور اس کی جگہ میں اس قعرِ معاش میں اتر کر اسی طرح ہاتھوں پانو کی قوت سے رہٹ کھینچنے لگا۔ کام تو بہت مشکل تھا مگر مجھے اس میں یہ سہولت نظر آئی کہ میں ستانے کے وقت مطالعہ کر سکوں گا۔ میں مزدور ضرور تھا لیکن کبھی کبھی چھٹی کے بعد شام کو اپنے فکر و خیال کی دنیا میں خود کو آزاد اور با اختیار سا انسان محسوس کرنے لگا تھا۔

تمام دن رہٹ کھینچتے کھینچتے میرے بازو اور رانیں اکڑ گئیں اور میں پسلیوں میں دکھن ہی نہیں سوجن سی محسوس کرنے لگا، میں نے شام کو گھر پہنچتے ہی تمام بدن پر تیل کی مالش کر کے گرم پانی سے غسل کیا، اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ پر ہوا کا دباو کم ہو گیا ہے یا زمین میں کشش کم ہو گئی، معلوم ہو رہا تھا کہ میرے رگ و ریشہ میں کنگھی سی ہو گئی، میں آرام ملنے سے جلدی ہی سو گیا اور صبح کو اٹھتے ہی پھر مالش کی اور بغیر نہائے کام پر چلا گیا۔ پانچ سات روز کے بعد مجھے اس مشقت کی عادت سی پڑ گئی اور وہ رہٹ میرے لیے معمولی سی بات رہ گئی۔

میں نے اپنے ساتھی رتنا سے کہا۔ 'اس طرح مجھے پڑھنے کا وقت زیادہ نہیں ملتا۔ اس لیے اب سے ایک ایک گھنٹہ رہٹ کھینچیں گے تا کہ ایک گھنٹہ تو آرام کو مل جائے، اس طرح تو انتڑیاں پک جائیں گی، رتنا کو کیا عذر ہو سکتا تھا، چنانچہ ہم دونوں ایک ایک گھنٹہ کام کرنے لگے۔ اس طرح مجھے دن میں چار گھنٹے مطالعہ کرنے کو مل جاتے اور جسمانی مشقت کے ساتھ روحانی تسکین بھی ہو جاتی۔ بعض اوقات تو مطالعہ کرتے کرتے مجھے نیند آ جاتی اور رتنا مجھے نہ جگاتا اور رہٹ کھینچتا رہتا۔ وہ میرے آرام و سکون سے واقف ہو گیا تھا، چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے نیند آ گئی اور مستری یا میٹ پھرتا پھراتا ادھر آ گیا تو رتنا نے انھیں کہہ دیا کہ ابھی کام کرتے کرتے بیٹھا تھا، آنکھ لگ گئی، انھیں تو اپنے کام سے کام تھا کہ بڑا حوض بھرا رہے اور پانی میں کمی نہ ہو۔ چناں چہ وہ خاموش ہو کے رہ گئے، جب میں جاگتا تو رتنا مجھے بتاتا کہ مستری یا جمعدار آیا تھا۔ میں کسی فکر کے بغیر اپنے اسی روزی کے مزار میں اتر کر رہٹ کھینچنے لگتا اور اتنی ہی دیر کام کرتا جتنی دیر رتنا کام کرتا۔

کچھ دنوں بعد رتا نے جمعدار سے کہا۔ 'میری جگہ کسی اور مزدور کو لگا دیا جائے، میرے پیٹ میں تکلیف رہتی ہے۔ لیکن جمعدار نے پرواہ نہ کی اور پھر کوئی دوسرا مزدور اس کام پر آنے کو تیار بھی نہیں ہوتا تھا۔ تمام مزدور اس رہٹ کے چکّر سے گھبراتے تھے۔ رتا مجبور تھا، کیا کرتا، برابر کام میں جٹا رہا۔ جب اس کی تکلیف کے متعلق مجھے معلوم ہوا اور اس نے اپنی کیفیت بتائی تو ازراہِ ہمدردی میں نے اس سے کہا۔ 'اچھا تم ایک گھنٹہ کام کرنا، میں دو گھنٹے رہٹ کھینچوں گا'۔ رتا کی نگاہیں ممنونیت سے جھک گئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔

رتا آنکھ ناک کا سجل، خوب صورت اور گٹھیلے بدن کا نوجوان تھا۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کے لٹ پٹی پگڑی باندھ کر چلتا تو ہرنوٹا معلوم ہوتا۔ ہاڑ گوڑ کا نہایت مضبوط اور بڑا ہی سیدھا سادا معصوم اور محنتی، نہ معلوم ماں باپ نے کن مجبوریوں کے تحت ایسے لعلِ شب چراغ کو اپنے سینے سے جدا کر کے اس جاں کاہ مشقت کے جبڑوں میں دے دیا تھا۔ وہ راجپوتانہ کا رہنے والا تھا اور اس کے گانو کی سرحد جے پور سے ملتی تھی۔ چناں چہ وہ مضافات کی زبان بولتا تھا۔ رتا سے بات کرتے ہوئے حضرت امیر خسرو کا وہ تاثر مجسم سامنے آجاتا تھا۔

یک ہندو بچہ ہیں کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھور جھرے چھے
گفتم کہ لبِ لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ہرے رام تُرک کاے کرے چھے

غرض کہ میرا یہ ساتھی رتا بڑا ہی نیک اور سودھلا نوجوان تھا، میں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں کہ تقدیر نے لاہور میں لا پھینکا اور بدقسمتی سے کام بھی ایسا ملا جو آدمی نہیں بیل کرتے ہیں۔

ایک دن رتا کام پر نہیں آیا۔ اس کے ساتھیوں سے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ مدد کے منشی نے میرے ساتھ اپنے لڑکے کو لگا دیا جو غالباً اسکول کی آٹھویں سے بھاگا ہوا تھا اور عمر بیس اکیس سال کی ہو رہی تھی۔ بے کاری سے تنگ آ کر اب باپ کی وجہ سے مزدوری کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اس سے پہلے اسے ہلکا پھلکا کام دے دیتا اور اسی طرح دن گزر رہے تھے۔

اس کے باپ نے خیال کیا کہ جب احسان جیسا لڑکا بھی یہ کام کر لیتا ہے تو شاید یہ رہٹ کا چکّر اتنا بھاری کام نہیں ہے کیوں نہ احسان کے ساتھ اپنے لڑکے کو گل جوڑ کر دوں، ڈیل ڈول میں بھی وہ مجھ سے ذرا جیتا سا تھا۔

اس نے میرے ساتھ صرف ایک دن کام کیا تھا جب دوسرے دن کام پر آیا تو لوگوں میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں کہ جس کی جگہ منشی کا لڑکا کام پر لگا ہے، وہ نوجوان رتا انتقال کر گیا۔ اسے تین چار خون کے دست آئے اور بس دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔ اس کے تمام ساتھیوں اور ہمسایوں کو اس کی موت سے بڑا صدمہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کیسا گبرو جوان ڈھے گیا، میری نظر میں تو

وہ زندہ آدمی کی طرح ہفتوں مسکراتا رہا، وہ میرا بڑا ہی پیارا ساتھی تھا اور ایک جگہ خلوص کے ساتھ کام کرتے کرتے ہم ایک دوسرے سے بہت ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اپنے مذہب کی پروا کیے بغیر آنکھ بچا کر میرے ساتھ کھانا بھی کھا لیا کرتا تھا۔ موت کیسے کیسے عزیزوں کو اچک لیتی ہے اور پھر پتا نہیں دیتی۔

میرا معمول تھا کہ جب مزدوری سے گھر جاتا تو پہلے تیل کی مالش اور پھر گرم پانی سے غسل ضرور کرتا۔ اس عمل سے دن بھر کی تھکن دور ہو جاتی اور جسم پھول کی طرح ہلکا اور لطیف ہو جاتا۔ ان دنوں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میری رگیں تانبے کے تاروں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور گوشت سیسے میں بدل رہا ہے۔

منشی کے لڑکے کو میرے ساتھ کام کرتے چھٹا دن تھا کہ شام کو گھر پہنچتے ہی اسے بھی ایک خون کا دست آیا۔ رتا کی موت سے پہلے ہی مزدوروں میں ہیبت پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ دوسرے روز منشی نے اپنے لڑکے کو کام پر نہ آنے دیا اور رہٹ پر میں اکیلا رہ گیا۔ مزدوروں کو کہا گیا مگر سب نے انکار کر دیا۔ آخر کار ٹھیکے دار نے مجھ سے کہا۔ 'یہ کام تم اکیلے کر سکو تو تمھیں ہی ڈبل مزدوری دے دی جائے گی، کیا خیال ہے؟'

میں نے کہا۔ 'اچھا کر لوں گا، مگر مجھ پر آنے جانے میں وقت کی قید نہ لگائی جائے۔ میں چاہے جس وقت، آؤں چاہے جس وقت جاؤں، کام کروں یا بے کار بیٹھا رہوں، کوئی اعتراض نہ ہو، میں اس کا ذمّے دار ہوں گا کہ حوض لبالب رہے اور پانی ٹوٹنے نہ پائے، ٹھیکے دار نے کہا۔ 'میاں جی ہمیں تو کام سے غرض ہے اور مدد کے لیے پانی چاہیے۔' میں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ مگر اس لیے کہ مجھے مطالعہ کے لیے وقت درکار تھا اور لائبریری بہت نزدیک تھی، اس کے بعد کسی شخص نے مجھے رہٹ کھینچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور حوض کا پانی کبھی کم نہیں ہوا، اس پر بعض لوگوں میں سرگوشیاں اور بعض میں چہ می گوئیاں بھی ہوئیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ عامل ہے کوئی بنکارتا تھا کہ اس کے تابع ہمزاد ہے ورنہ یہ کام کرتا ہے تو اسے بھی رتا کی طرح مر جانا چاہیے تھا، اس کے پاس تو کوئی اوپری طاقت ہے، یہ تو برائے نام مزدوری کرتا ہے۔

میں صبح چاند تاروں کی چھانو میں اٹھتا اور بدن پر تیل مل کر رہٹ کھینچنا شروع کر دیتا دن نکلنے تک حوض کناروں سے چھلکنے لگتا اور میں بے فکر ہو جاتا، اب رہٹ میرے لیے ایک ورزش ہو گئی تھی، میرے بازوؤں میں مچھلیاں ابھر آئی تھیں اور رانیں ڈھولکیوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ میں حوض بھر کے وہیں ٹہلتا رہتا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مدد کی طرف چکر لگا کے حوض کا جائزہ لیتا رہتا۔ جب پانی ٹوٹتا فوراً رہٹ کھینچنے لگتا اور ذرا سی دیر میں حوض کو ڈاٹ ڈول کر دیتا۔

جب یونی ورسٹی سے مدد کم کی گئی اور تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تو مجھے ایک چھلائی والے معمار محمد اکبر کے ساتھ لگا دیا گیا۔ محمد اکبر لکھائی چھلائی اور مجسّمہ سازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس نے چند روز کی نزدیکی سے میرے اندر بچپن کے سوئے ہوئے فن کار کو جگا دیا اور مجھ سے اپنا فن چھپانے کی کوشش نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں چند ہی روز میں لکھائی چھلائی کی طرف چل نکلا۔ بہت کم

لوگوں کو معلوم ہے کہ یونی ورسٹی میں سینٹ ہال کے دروازے پر سیمنٹ سے بنے ہوئے .P.U کے حروف میں بھی میرا گرم خون شامل ہے۔

ایک زمانے کے بعد جب میں ممتحن کی حیثیت سے اپنا چیک وصول کرنے یونی ورسٹی آفس میں گیا تو مزنگ کے رہنے والے کئی لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور شاہ صاحب نے تو بڑے تعجب سے پوچھا: 'اچھا جناب یہ احسان دانش آپ ہیں؟ میں نے عرض کی۔ 'جناب آپ کی دعا سے میں وہی اس پنجاب یونی ورسٹی کا مزدور ہوں جسے آپ گارا ڈھوتے، رہٹ کھینچتے اور پھر معماری میں لکھائی چھلائی کرتے دیکھتے رہتے تھے۔' انھوں نے کہا۔ 'بس اب آپ کو مرجانا چاہیے کیوں کہ ایسی ترقی ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ کمال ہے! جہاں ایک شخص یونی ورسٹی جیسے ادارے میں مزدور کی حیثیت سے اینٹیں گارا ڈھوتا ہو اور بیل بن کر رہٹ کھینچے ،وہ وہیں ممتحن کی حیثیت بھی اختیار کر لے، یہ تو شاید اب تک ہندستان بھر میں پہلی ہی مثال ہے۔'

میں نے عرض کی۔ 'جناب چونکیے نہیں۔ میں تو 'مزدور یونی ورسٹی' بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر عمر اور وقت نے ساتھ دیا تو اپنی یادگار میں تصانیف کے علاوہ ایک اعلا قسم کی لائبریری اور ایک یونی ورسٹی چھوڑ کر جاؤں گا۔

لفظ و معنی

دیانت دار	-	ایمان دار
مرتاض	-	ریاضت کرنے والا، عبادت میں مشقت کرنے والا
صاحبِ احتیاج	-	ضرورت مند
مدد لگنا	-	معماروں اور مزدوروں کا تعمیر کے کام پر لگنا
مرقد نما	-	قبر جیسا
کارگہہ	-	کارگاہ کا مخفف، کارخانہ، ورکشاپ، چیز بنانے کی جگہ
بیل دار	-	وہ شخص جس کا پیشہ زمین کھودنا ہو، محکمہ نہر کے کارندے جو گڑھے وغیرہ بھرتے ہیں
رگ و ریشہ	-	رگ، پٹھا
عذر	-	اعتراض، بہانہ
ممنونیت	-	احسان مندی
سجل	-	عمدہ، نفیس
ہرنوٹا	-	ہرن کا بچہ
جاں کاہ	-	جس سے جان گھل جائے، تکلیف دہ، محنت طلب

لطیف - صاف، پاکیزہ، نرم

یدطولیٰ - مہارت، دست رس، لمبا ہاتھ

آپ نے پڑھا

- ایک مشہور و معروف شاعر احسان دانش کی خودنوشت 'جہان دانش' سے یہ حصہ اخذ کیا گیا ہے۔
- اس خودنوشت سے انسان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ احسان دانش نے رہٹ پر بیل کی طرح کام کر کے محنت و مشقت کی ترغیب دی ہے۔ وہ یونی ورسٹی جیسے ادارے میں مزدور کی حیثیت سے اینٹیں گارا ڈھوتا ہے، بیل کی طرح رہٹ کھینچتا ہے اور بعد میں اسی ادارے میں ایک ممتحن کی حیثیت سے بھی جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مثال خال خال ہے۔
- محنت و مزدوری کے ساتھ مطالعہ کے لیے وقت نکال لینا اور تندرستی کا خیال رکھتے ہوئے ورزش کے مانند بدن پر تیل مالش کرنا اور گرم پانی سے غسل کرنا، اعلا مقام کی جانب پرواز کی سعی ہے۔
- اس خودنوشت میں آپ نے پڑھا کہ احسان دانش نے کس طرح محنت مزدوری کر کے اس دنیا میں اپنے لیے مقامِ بلند پیدا کیا اور یادگار کے طور پر بھی کچھ چھوڑنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ طلبہ کے لیے حوصلہ افزا مقام ہے۔

آپ بتایئے

1. معمار کس کو کہتے ہیں؟
2. بدھو کیسا مستری تھا؟
3. رہٹ پر مزدور کی مزدوری کتنی تھی؟
4. رہٹ سے کیا مراد ہے؟
5. رتّا کون تھا؟
6. احسان دانش نے کس یونی ورسٹی میں مزدور کا کام کیا؟
7. عام طور پر رہٹ چلانے کا کام کس جانور سے لیا جاتا ہے؟
8. رتّا کی نگاہیں ممنونیت سے کیوں جھک گئیں؟
9. 'ہرنوٹا' کس کو کہتے ہیں؟
10. منشی کے لڑکے نے کیوں کام چھوڑ دیا؟

مختصر گفتگو

1. رہٹ کے پانی سے کون کون سے کام لیے جاتے تھے؟

2. رتا کی موت کیسے ہوئی؟
3. احسان دانش اپنی یادگار کے بہ طور کیا چھوڑنا چاہتے تھے؟
4. مصنف تکان مٹانے کے لیے کیا ترکیب کرتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. رتا نے کام کیسے شروع کیا اور احسان کو ڈھارس کیسے بندھی؟
2. احسان کے مطالعہ میں رتا نے کیسے مدد کی۔ تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. 'ایک مزدور سے اعلا عہدے تک پہنچنے میں کن باتوں کا دھیان دینا ضروری ہوتا ہے۔' اس خودنوشت کی روشنی میں لکھیے۔
4. کن اوصاف کی بنا پر احسان دانش ایک مزدور سے ممتحن کے عہدے پر پہنچے؟ تفصیل سے بتائیے۔

- اسم کی قسموں کی تعریف کیجیے اور مثالیں اس خودنوشت سے دیجیے۔
- جنس واضح کرتے ہوئے جملے بنائیے۔

وسیع، ہمراہ، مسجد، مرقد، محنت، گہرا، مدد

- اردو میں جمع بنانے کے چار قاعدے کی تعریف مثالوں کے ساتھ لکھیے۔
- درج ذیل محاورات کے معنی واضح کرتے ہوئے جملے بنائیے۔

دانتوں میں انگلی دبانا، آنکھ بچھانا، بات کو پی جانا، آنسو پی جانا، خاک کا پیوند لگانا

- درج ذیل الفاظ کی ضد بتائیے۔

گہرا، شب، بیمار، ہلکا، لطیف، تعریف، آشنا

آیئے، کچھ کریں

1. احسان دانش کی خودنوشت کا مطالعہ کیجیے۔
2. اس خودنوشت کو پیش نظر رکھ کر آپ تعلیم جاری رکھنے کے لیے راہ تلاش کیجیے اور استاد سے مشورہ کیجیے۔
3. کیا آپ کے ساتھیوں میں کوئی محنت مزدوری کر کے تعلیم کو برقرار رکھے ہوئے ہے؟ اس کی کہانی اپنی زبان میں لکھیے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور 86-1785 کے قریب پیدا ہوئے۔ یہ لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ سرور لکھنو میں ہی پلے بڑھے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ ان کی تعلیم کس قدر تھی، اس کا حال معلوم نہیں لیکن وہ اردو اور فارسی سے بخوبی واقف تھے اور کسی حد تک عربی بھی جانتے تھے۔ سرور کا لگاؤ فنونِ سپہ گری، خطاطی اور موسیقی سے تھا۔

سرور نے ایامِ جوانی میں شاعری شروع کی اور میر سوز کے شاگرد آغا نوازش کو اپنا استاد بنایا لیکن سرور شاعری میں اپنی کوئی پہچان نہیں بنا سکے۔ وہ ساری عمر معاشی اعتبار سے پریشان ہی رہے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں وہ لکھنؤ سے کانپور آئے اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں دوبارہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ محمد علی شاہ کے دورِ حکومت میں سرور کو ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن محمد علی شاہ کے بیٹے کے زمانے (1842-1847) میں ان کی ملازمت برقرار نہیں رہ سکی۔ عہدِ واجد علی شاہ میں پچاس روپے ماہانہ پر ان کا تقرر رہوا۔ اسی زمانے میں ان کی دوسری اہلیہ کا وصال ہو گیا اور کان پور میں رہنے والی پہلی بیوی سخت بیمار ہو گئیں۔ بدلتے سیاسی حالات کی وجہ سے جب سرور کا وظیفہ بند ہو گیا تو سندیلے کے رئیس امجد علی خاں بلوچ نے ان کی سرپرستی کی۔ 1857 کی بغاوت کے بعد مہاراجا بنارس نے سرور کو سو روپے مہینے پر ملازم رکھ لیا۔ وہ جولائی 1859 میں بنارس پہنچے اور چند دنوں کے بعد رام نگر چلے آئے جہاں دس برسوں تک ان کا قیام رہا۔ رام نگر میں ہی 1869 میں سرور کا انتقال ہوا اور وہ پنچ پٹی کے مقام پر واقع قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ واضح رہے کہ رام نگر اس وقت بنارس ہی کا ایک حصہ ہے۔

سرور اردو دنیا میں اپنی تصنیف 'فسانۂ عجائب' کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔ اردو ادب کی یہ کلاسیکی کتاب 1825 میں کان پور میں لکھی گئی۔ فسانۂ عجائب کے علاوہ 'سرورِ سلطانی'، 'شگوفۂ محبت'، 'شبستانِ سرور'، 'گلزارِ سرور'، 'فسانۂ عبرت'، 'شرارِ عشق'، 'نثر نثرہ شار' اور 'انشائے سرور' ان کی دیگر کتابیں ہیں۔

فسانۂ عجائب

سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج وتخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں درآئی، وہیں احتیاج پکاری: میں برآئی۔ یہاں تک کہ لقب اس کا نزدیک ودور 'خدادوست' مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خدادوست ہے، تو للہ تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بسم اللہ۔ جو ارکینِ سلطنت، مسند نشینِ حکومت حاضر تھے؛ بہ تاکید انھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، مورِدِ عتاب سلطانی ہوگا۔ یہ فرما، فرماں رواتخت سے اٹھا، سائل جا بیٹھا حکم رانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا: اب قصد کیا ہے؟ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ سائل بولا: پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ برائے خدا یہ تاج وتخت یک لخت مجھے بخش دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بہ رضائے خدا یہ حکومت آپ کو مبارک ہو، میں بہ خوشی دے چکا۔ بادشاہت دے کر، کچھ نہ ہیہات لیا، فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا۔ اتنے دنوں سلطنت، حکومت کے چندے فقیری کی کیفیت، فاقے کی لذت دیکھیے، گو جاہ وحشم مفقود ہے، مگر شاہی بہ ہر کیف موجود ہے؛ اِلّا اس شہر میں سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکمِ خدا قل سیروانی الارض ہے۔ دنیا جائے دید ہے۔ عنایت خالق سے کیا بعید ہے جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا، بلکہ تکلف کا لباس بھی وہ خداشناس بار سمجھا، نہ لیا، جامۂ عریانی جسم پر چست کیا اور چل نکلا۔ نیرنگیِ سپہرِ بوقلموں، دنیائے دوں کا یہ نقشہ ہے، مصرع

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

کل وہ سلطنت، ثروت، کرّ وفر، افسر وتاج؛ آج یہ مصیبت، اذیت، در بہ در، پیادہ پا سفر محتاج۔ کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقارہ وکوس، بہ ہزار رنج وتعب چلتا۔ جو کچھ میسر آیا، وہ روزی ہوئی، نہیں تو روزہ۔ یوں ہی ہر روز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی چند روز میں ایک شہر ملا، مسافر خانے میں بادشاہ اترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا۔ قافلہ باہر اتار، تنہا گھوڑے پر سوار سیر کرتا مہمان سرا میں وارد ہوا۔ شہزادی گو کہ گردِ راہ، صعوبتِ سفر کی مبتلا تھی، لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدی۔

حاجتِ مشاطہ نیست روی دلآرام را

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بہ یک نگاہ از خود رفتہ ہوا، سانس سینے میں اڑی۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اس عرصے میں وہ غدار حیلہ سوچا، بہت فسردہ خاطر ہو کر کہا: اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زہ ہو رہا ہے۔ دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں۔ تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو للہ میرے

ساتھ کردے، تا اس کی شراکت سے اس کو رنج سے نجات ملے، وگرنہ بندۂ خدا کا مفت خون ہوتا ہے، آدمی کا مرجانا زبوں ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا نام سن کر گھبرائے، بی بی سے کہا: زہے نصیب! جو محتاجی میں کسی کی حاجت برآئے، کام نکلے۔ بسم اللہ، دیر نہ کرو۔ اس نے دم نہ مارا، کھڑی ہوگئی، سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل اس غریب نے کہا: قافلہ دور ہے، مجھے آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے۔ آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں۔ وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پر بٹھا، باگ اٹھائی۔ قافلے کے پاس پہنچ کے کوچ کا حکم دیا، آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا۔ اس وقت اس نیک بخت نے داد بے داد، فریاد مچائی۔ تڑپی، روئی پیٹی، چلائی۔ آہ وزاری اس کی، اس بے رحم، سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی۔

بادشہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا: خود چلیے، دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا۔ ہر چند ڈھونڈھا، نشان کے سوا قافلے کا سراغ نہ ملا۔ دور گرد سیاہ اڑتی دیکھی، جرس اور زنگ کی صدا سنی، نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب، سب طرح کا عذاب۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار، نہ خدا ترس، نہ فریادرس، بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ یہ کہا:

مصحفی :

تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے، تو ہم رہے

لاچار، لڑکوں کو لے کر اسی طرف چلا۔ چند گام چل کر اضطراب میں راہ بھول گیا۔ ایک ندی حائل پائی، مگر کشتی نہ ڈونگی نہ ملاح۔ نہ راہ سے یہ آشنا، نہ وہاں سیاح کا گزارا۔ کنارے پر دریا کے خاک اڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی

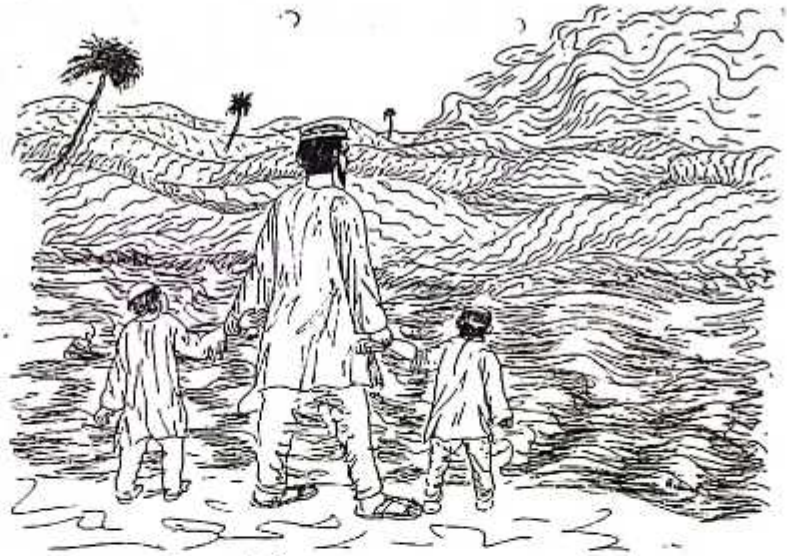

تباہی پھرا۔ رہ بر کامل کو پکارا، ساحلِ مطلب سے ہم کنار نہ ہوا، بیڑا پار نہ ہوا۔ مگر کچھ ڈھبڈھبانے کا ڈھب تھا۔ گو گھاٹ کڈھب تھا، ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اٹھا، دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا، کنارے کا لڑکا بھیڑیا اٹھا لے

چلا۔ وہ چلایا، بادشاہ آواز سن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مضطرب جو ہوا، خود غوطے کھانے لگا، لیکن زندگی باقی تھی۔ بہ ہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا: بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب کے موا۔ نیرنگیِ فلک سے عالمِ حیرت، بی بی کے چھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے الم سے دل کباب، سلطنت دینے سے خستہ و خراب۔

لفظ و معنی

فرخندہ بخت	-	خوش نصیب
حق نیوش	-	سچی بات سننے والا، حق پسند
درآنا	-	اندر آنا، داخل ہونا
احتیاج	-	ضرورت، حاجت
برآنا	-	کام پورا ہونا
اراکین	-	رکن کی جمع، ممبران
موردِ عتاب	-	وہ شخص جس پر غضب نازل ہو
فرماں روا	-	بادشاہ
یک لخت	-	فوراً، تمام
ہیہات	-	افسوس، ہائے ہائے
جاہ	-	مرتبہ
حشم	-	شان و شوکت
چندے	-	کچھ روز، کچھ عرصہ
مفقود	-	غائب، کھویا ہوا
اِلّا	-	لیکن، مگر
قل سیروفی الارض	-	کہہ، زمین پر گھومو پھرو
تہی دست	-	خالی ہاتھ
نیرنگ	-	فریب، مکر
سپہر	-	آسمان
بوقلموں	-	رنگا رنگ، مختلف رنگوں کا
دنیائے دوں	-	کمینی دنیا
کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است	-	کہ یہ بڑھیا (دنیا) ہزاروں آدمیوں کی دلہن بن چکی ہے

ثروت	-	دولت مندی، حکومت
کرّ و فر	-	شان وشوکت، ٹھاٹ باٹ
کوس	-	بڑا نقارہ
تعب	-	سختی، تکلیف
صعوبت	-	مصیبت، سختی
حاجتِ مشاطہ نیست روی دلآرام را	-	محبوب کے چہرے کے لیے مشاطہ (بناو سنگار کرنے والی عورت) کی ضرورت نہیں
از خود رفتہ	-	آپے سے باہر، بے خود، دیوانہ
افسردہ خاطر	-	رنجیدہ، مرجھایا ہوا
دردِزہ	-	بچہ پیدا ہونے کا درد
کج ادائی	-	بے مروتی، بے وفائی
زبوں	-	منحوس، نحس، برا
باگ اٹھانا	-	گھوڑا دوڑانا، چل پڑنا
داد بے داد	-	فریاد، دہائی
جرس	-	وہ گھنٹہ جو قافلے میں روانگی کے وقت بجایا جاتا ہے
زنگ	-	گھنٹی، گھنگرو
ماہیِ بے آب	-	وہ مچھلی جو پانی سے باہر نکالی جائے، بہت بے تاب
واہی تباہی پھرنا	-	پریشان حال پھرنا

آپ نے پڑھا

- ❑ 'فسانۂ عجائب' رجب علی بیگ سرور کی تصنیف کردہ معروف داستان ہے۔ یہ داستان 'باغ و بہار' سے تقریباً 20 برسوں کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی تصنیف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ زبان کی آرائش وزیبائش اور لکھنوی تہذیب کو ترجیح دی جائے۔
- ❑ 'فسانۂ عجائب' میں باغ و بہار کے برعکس مرصّع اور مقفّیٰ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں زبان اور اسلوب کا حسن تو ہے لیکن سہل اور سلیس انداز کا فقدان ہے۔ یہ خوبی باغ و بہار میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔
- ❑ 'فسانۂ عجائب' کے اس ماخوذ حصے میں ملک یمن کے ایک بادشاہ کا حالِ زار بیان کیا گیا ہے۔ جو اپنی حکومت ایک اجنبی سائل کو سونپ کر سلطنت سے باہر چلا جاتا ہے۔ بادشاہ اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ سفر کی صعوبت اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے ایک سوداگر کے فریب میں آجاتا ہے۔ سوداگر اس کی بیگم کو دھوکے سے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور بادشاہ اس کی تلاش میں نڈھال ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک بچہ غرقاب ہوتا ہے، دوسرے کو بھیڑیا اٹھالے جاتا ہے۔

❑ اس داستان میں ایک طرف جہاں بادشاہ کی سادگی، نیک نیتی اور درویشانہ صفات کو اجاگر کیا گیا ہے، وہیں دوسری طرف اس پر آئی مصیبتوں کو بھی پُر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ داستان کے اس حصے میں سرور کی زبان پر کشش اور اسلوب دل کش ہے۔ قصے کو بیان کرتے وقت اس کے ارتقا کے ساتھ زبان دانی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

آپ بتائیے

1. فرخندہ بخت کس کو کہا گیا ہے؟
2. سائل کو کیا ملا؟
3. بادشاہ سلطنت چھوڑ کر کہاں گیا؟
4. سوداگر نے بادشاہ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
5. بادشاہ کی بیگم کس کے ساتھ گئی؟

مختصر گفتگو

1. بادشاہ کس مزاج کا آدمی تھا؟
2. سوداگر نے بادشاہ سے کیا کہا؟
3. بادشاہ کی پریشانی کیوں بڑھ گئی؟
4. بادشاہ کے بچے کہاں گئے؟

تفصیلی گفتگو

1. بادشاہ اور سائل کے کردار میں کیا فرق ہے؟ مفصل بیان کیجیے۔
2. سوداگر نے کیا دھوکا کیا؟
3. بادشاہ کا بیگم کی تلاش میں نکلنے کے بعد کا قصہ اپنی زبان میں لکھیے۔
4. بادشاہ کی بدقسمتی کا جائزہ لیجیے۔
5. بادشاہ کے اہل خانہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟

آیئے، کچھ کریں

1. لائبریری سے فسانۂ عجائب حاصل کیجیے اور اس سے اپنے سرمایۂ الفاظ کو وسیع کیجیے۔
2. سرور کی دوسری کتابوں کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ماں کا نام سیوا دیوی تھا جو برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ والد ہیرا سنگھ بیدی کھتری سکھ تھے۔ بیدی کا گھرانہ مذہبی رواداری کا حامل تھا جس کا اثر بچپن میں ہی ان کے دل و دماغ پر پڑا۔ بیدی کی والدہ اردو ہندی سے واقف تھیں۔ ماں، باپ، چچا سب کو کتابوں کا ذوق تھا۔

راجندر سنگھ بیدی نے 1931 میں لاہور سے میٹریکولیشن کیا۔ 1933 میں ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے۔ میں داخلہ لیا لیکن اسے پورا نہیں کر سکے اور والد کے کہنے پر لاہور پوسٹ آفس میں کلرکی کر لی۔ بیدی ابھی انٹرمیڈیٹ کے طالبِ علم تھے کہ ان کی والدہ کا وصال ہو گیا۔ اس کے چار پانچ برس بعد والد بھی چل بسے۔ بیدی نے والدین کی بڑی خدمت کی۔

1934 میں بیدی کی شادی سوماوتی سے ہوئی جس کا نام بدل کر انھوں نے ستونت کور رکھا۔ بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہوا۔ ابتدا میں انھوں نے انگریزی میں نظمیں لکھیں اور اردو پنجابی میں افسانے بھی قلم بند کیے۔ انھوں نے لاہور کے ایک رسالے 'سارنگ' کی ادارت بھی انجام دی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ محسن لاہوری کے نام سے لکھتے تھے۔

1943 میں بیدی نے ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔ چھ ماہ تک دہلی میں حکومت کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سے منسلک رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ 1946 میں 'سنگم پبلشرز لمیٹڈ' نام کا اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ تقسیمِ ہند کے وقت جب فسادات کی آگ بھڑکی تو اپنے بھائی ہربنس سنگھ کے پاس روپڑ چلے گئے۔ وہاں سے شملہ گئے۔ 1948 میں انھیں جموں ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ غلام محمد بخشی سے نہیں نبھی تو 1949 میں وہاں سے واپس آ گئے اور دہلی ہوتے ہوئے بمبئی جا کر مستقل قیام کیا۔ وہاں کئی فلموں کے مکالمے اور منظر نامے قلم بند کیے۔ انھیں حکومتِ ہند کی جانب سے پدم شری کا خطاب ملا۔ وہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور مودی غالب ایوارڈ سے بھی نوازے گیے۔ 1979 میں بیدی پر فالج کا حملہ ہوا۔ 11 نومبر 1984 کو بمبئی میں وہ انتقال کر گئے۔

'دانہ و دام'، 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'، اور 'مکتی بودھ' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ایک چادر میلی سی' ان کا ناولٹ ہے۔ 'بے جان چیزیں' اور 'سات کھیل' ڈراموں کے مجموعے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی

کوارنٹین

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پانو میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کُہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلّط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوف ناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے، اور یہی وجہ تھی کہ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لیے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں اور گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا، اس پر 'نہ چوہا نہ پلیگ' کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے 'نہ چوہا نہ پلیگ نہ کوارنٹین' لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بہ حیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں، اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالاں کہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں بلکہ اس وسیع رقبے کا نام ہے جس میں متعدّی وبا کے ایّام میں بیمار لوگوں کو تن درست انسانوں سے ازروے قانون علاحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کے کثرت سے وہاں آجانے پر ان کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے در پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا اور کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقے پر ادا ہوتیں۔ یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتّوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کیے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لیے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اسے چھپانے لگتے تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چوں کہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لیے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتا چلتا جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بہ طور ایک ڈاکٹر..... کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلّط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصے تک کاربالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی

لیتا۔ اگرچہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہوگئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کو جاتے تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں — اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا — پلیگ! اور پھر — کوارنٹین!

انھیں دنوں میں نوعیسائی ولیم بھاگو خاکروب جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا، میرے پاس آیا اور بولا۔ 'بابو جی — غضب ہوگیا، آج ایمبولنس اسی محلّہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔'

'اکیس؟ ایمبولنس میں —؟ میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

'جی ہاں — پورے بیس اور ایک — انھیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے — آہ! وہ بے چارے کبھی واپس نہ آئیں گے۔'

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے اور پھر حسبِ ہدایت کمیٹی کی گلیوں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے، تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بجے اٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اس محلّے میں جہاں وہ کام کرتا ہے، ان لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر موت آنی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے، بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا، بھاگو سر اور منہ پر منڈاسا باندھے نہایت انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا علم نہایت محدود تھا۔ تاہم اپنے تجربے کی بنا پر وہ ایک مقرّر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی تراکیب بتاتا۔ عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔ 'بھاگو تمھیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟'

'نہیں بابو جی — بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ اِتّے بڑے حکیم ٹھیرے، ہجاروں نے آپ کے ہاتھ سے سفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کی دوادارو بھی کچھ اثر نہ کرے گی — ہاں بابو جی — آپ برا نہ مانیں، میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں۔' اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ 'کچھ کونٹین کی کہیے بابو جی — کونٹن کی!'

'وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آ گئے ہیں۔ ہم حتی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر ان کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے ان کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمھاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمھاری طرح اتنی جان مارتا ہے — بھاگو خدا تمھارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو —!'

بھاگو نے گردن جھکا دی، اور منڈاسے کے ایک پلّو کو منہ پر سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا۔ 'بابو

جی! میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ نکما تن کسی کے کام آ جائے۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے، بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونت ل، آبے) جو ہمارے محلّوں میں اکثر پرچار کے لیے آیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو — میں سمجھتا ہوں —!'

میں نے بھاگو کی ہمّت کو سراہنا چاہا۔ مگر کثرتِ جذبات سے میں رک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بہ قیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوف ناک حالت دیکھی اور ان کے منہ سے پیدا شدہ تعفّن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمّت نہ پڑی۔

تاہم اس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا، وہ میں نے بھاگو سے کرایا اور اس نے بلا تامّل کیا..... خود میں مریضوں سے دور دور ہی رہتا۔ اس لیے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

یہ بھاگو کی جاں بازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا، اس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے اس کمرے میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سوفی صد کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا، نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کے مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی، اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا۔ 'بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں.....'

بھاگو نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ 'کھداوند یسوع مسیح کا سکر کرو بھائی — تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔'

'ہاں بھائی شکر ہے خدا کا— پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین—'

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کی نسیں کھنچ گئیں۔ اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ بھاگو اس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خون کے آنسو بہانے لگا۔ اور کون اس کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض وسما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتے دار تھا۔ سب کے لیے اس کے دل میں درد تھا، وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا۔ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز وانکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارے کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا، 'بابو جی— یہ کونٹین تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا۔'

میں نے کہا۔ 'ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے— میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں— میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔'

'بابو جی اس سے جیادہ اور کیا بات ہوسکتی ہے— آج ایک مریض جو بیماری کے کھوف سے بے ہوس ہوگیا تھا۔ اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاسوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں نے اسے سعلوں میں ہاتھ پانو مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اسے اٹھالیا۔ بابو جی وہ بہت بری طرح جھلس گیا تھا— اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں باجو بالکل جل گیا ہے۔'

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اس پر زرد زرد چربی نظر آرہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ 'کیا وہ آدمی بچ گیا ہے پھر—؟'

'بابو جی— وہ کوئی بہت سریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور سریفی (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی، اتنے درد وکرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا سکریہ کیا۔'

'— اور بابو جی۔' بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ 'اس کے کچھ دیر بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا— اس کے بعد وہ مرگیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں— اسے اسی وقت مرجانے دیتا۔ اسے بچا کر میں نے اسے مزید اور دکھ سہنے کے لیے جندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں، اب انھی جلے ہوئے باجوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔'

اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رکتے رکتے کہا۔

'آپ جانتے ہیں— وہ کس بیماری— سے مرا؟ پلیگ سے نہیں— کونٹین سے— کونٹین سے!'

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لامتناہی سلسلۂ قہر وغضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ وبکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ وپکار،

شہر کی اس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب الو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے، ایک نہایت الم ناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحت وسلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو ان لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنھیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کوارنٹین کے مریض جنھیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزو مند ہوں۔

میں اس روز وہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی — کیوں کہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھا، مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کو ارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا۔ 'بابو جی — میری بیوی بیمار ہوگئی — اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں — خدا کے واسطے اسے بچاؤ۔ اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی مر جائے گا۔'

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں خشمگیں لہجے میں کہا۔ 'اس سے پہلے کیوں نہ آسکے — کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟'

'صبح معمولی بخار تھا — جب میں کوارنٹین گیا —'

'اچھا — وہ گھر میں بیمار تھی پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟'

'جی بابو جی —' بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ 'وہ بالکل معمولی بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے — اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں — اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے — اور سینکڑوں مریض کوارنٹین میں بے بس —'

'تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو — دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمھارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جاں باز کو اپنی جاں بازی کا مزہ بھگتنا ہی چاہیے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں —'

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔ 'مگر خداوند یسوع مسیح —'

'چلو ہٹو — بڑے آئے کہیں کے — تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا ہے؟ اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'

'مگر پادری لابے —'

'چلو — جاؤ — پادری ل آبے کے کچھ ہوتے —'

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹے بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گزشتہ رویّے پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے—

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ 'اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا۔ 'کوئنٹین میں'۔

'تو کیا اب تمھاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں— بھاگو؟'

'آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا۔ بابو جی— اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا کھیال تھا، وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اس کا بھی کھیال رکھوں گا۔'

'یہاں رکھ دو چارپائی— ابھی تک تمھارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟— احمق—'

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی، میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ 'آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا بابو جی—'

میں نے کہا۔ 'مجھے اپنے گزشتہ رویّے پر سخت افسوس ہے بھاگو— ایشور تمھیں تمھاری خدمات کا صلہ تمھاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔'

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی مدّھم ہو کر شانے کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی۔ حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ 'بھاگو! بدنصیب بھاگو! تمھیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے—'

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دل دوز تھا، جب کہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچّے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لیے علاحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا— مگر اس سے اگلے روز میں نے اُسے بیش از بیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا— اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت میں میں نے شہر کے غریب طبقے کے لوگوں کے

گھروں سے جو کہ بدروؤں کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی، اسکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدّت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسان مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفریں کی بوچھار نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ وزیرِ بلدیات نے اس جلسے کی صدارت کی۔ میں صاحبِ صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ کیوں کہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی اِدھر دیکھتا اور کبھی اُدھر —

'بنی آدم کی انتہائی خدمت گزاری کے صلے میں کمیٹی شکر گزاری کے جذبے سے معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بہ طور "ایک حقیر رقم" میری نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقائے کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گزشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں، ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایے کو سرمایۂ ملّت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

وزیرِ بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجے کی طرف ہر لحظہ اُفتاں و خیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے نقشے میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چون مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحت یاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فی صد کامیاب رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیرِ بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمّت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ ہم لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلے میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اٹھا۔

انھی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اٹھائی۔ صاحبِ صدر اور معزّز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی توجہ

کے قابل غریب طبقے کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل نا قابل تھے اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں اور میرے رفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں ان ہی خوف ناک مسکنوں میں گزاریں۔

اسی دن جلسے کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُر غرور گردن کو اٹھائے ہوئے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ''ناچیز ہدیہ'' ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

'بابو جی — بہت بہت مبارک ہو۔'

— اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی پرانی جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

'تم ہو؟ — بھاگو بھائی!' میں نے بہ مشکل تمام کہا — 'دنیا تمھیں نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے — میں تو جانتا ہوں۔ تمھارا یسوع تو جانتا ہے۔ — پادری لاہے، کے بے مثال چیلے — تجھ پر خدا کی رحمت ہو —!'

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر آنکھوں میں کھنچ گئی۔ ہاروں کے بار گراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی اور — اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر ناشناس دنیا کا ماتم کرنے لگا!

لفظ و معنی

تسلط	-	قبضہ جمالینا
ہراساں	-	خوف زدہ
محکمۂ حفظانِ صحت	-	شہریوں کی صحت کی حفاظت کا سرکاری محکمہ
تلقین	-	ہدایت دینا، نصیحت کرنا
مستند	-	بھروسے کے لائق
وبا	-	پھیلنے والی بیماری جیسے ہیضہ، طاعون وغیرہ
خویش واقارب	-	قریب کا، عزیز، رشتے دار
نواح	-	آس پاس
جراثیم	-	جرثومہ کی جمع، کیڑے
نذرِ آتش	-	آگ کی نذر، جلانا
آتشیں	-	آگ کی طرح کا، آگ کے رنگ کا

شفق	-	شام یا صبح کے وقت آسمان میں پیدا ہونے والی لالی
نعش	-	لاش
تنبیہ	-	خبردار کرنا، واقف کرنا
آہ و بکا	-	رونا پیٹنا
حواس باختہ	-	گھبرایا ہوا، جو ہوش و حواس میں نہ ہو
قیاس	-	اندازہ لگانا
موذی	-	ایذا دینے والا، ستانے والا
منڈاسا	-	پگڑی
انہماک	-	یکسوئی کے ساتھ
حتی الوسع	-	جہاں تک ممکن ہو سکے، بساط بھر
بنی نوع انسان	-	انسان
تعفن	-	بدبو، سڑاند
بلاتامل	-	بغیر جھجک کے
خائف	-	خوف زدہ
لقمۂ اجل	-	موت کا لقمہ، موت کا شکار ہونا
آویزاں	-	ٹنگا ہونا
عنقریب	-	بے حد قریب
سراسیمہ	-	حیران ہونا
ارض	-	زمین
سما	-	آسماں
شق	-	پھٹا ہوا، شگاف، دراڑ
عجز و انکسار	-	منت سماجت
کفارہ	-	گناہ کے بدلے میں کیا جانے والا نیک عمل
مقہور	-	جس پر قہر ٹوٹا ہو
فلک شگاف	-	زوردار، آسمان میں سوراخ
یرقان	-	پیلیا، ایک بیماری جس میں سارا بدن پیلا ہو جاتا ہے

خشمگیں ۔ غصے کے ساتھ

نادم ۔ ندامت کرنے والا، پچھتانے والا، افسوس کرنے والا

پشیمان ۔ ندامت، افسوس

معذرت ۔ معافی

جانفشانی ۔ محنت کرنا

غیر مرئی ۔ وہ چیز جو دیکھی نہ جا سکے

ہیچ ۔ معمولی

مستعدی ۔ چوکسی، چاق و چوبند

مسکن ۔ رہایش، مکان، رہنے کی جگہ

احتمال ۔ شک، اندیشہ

دفاتر ۔ دفتر کی جمع

عظیم الشان ۔ بڑا

افتاں وخیزاں ۔ بدحواسی کی حالت میں

اعزاز ۔ تعظیم، عزت

بے توقیر ۔ بے عزت

آپ نے پڑھا

- اس افسانے میں آپ دو کرداروں، ڈاکٹر اور بھاگو، سے برابر روبرو ہوتے ہیں۔ دونوں یہاں اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پڑھے لکھے ڈاکٹر کے مقابلے ناخواندہ بھاگو کا کردار آپ کو زیادہ متاثر کرتا ہوگا۔ حالاں کہ بھاگو کا کام غلیظ ہے لیکن وہ اپنے فرض میں جس طرح منہمک ہے اور ڈاکٹر کو اس سے تحریک ملتی ہے، وہ کسی بھی پڑھنے والے پر اپنی چھاپ چھوڑے گا۔ بھاگو کو انسانوں سے محبت ہے، اس لیے ان کا مہلک مرض اس کو خوف زدہ نہیں کر سکتا۔ اس کی بیوی کی موت ہو جاتی ہے لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ مزید انہماک سے پلیگ کو مٹانے میں لگ جاتا ہے۔
- افسانے کے درمیان میں ڈاکٹر، بھاگو سے پوچھتا ہے کہ اس طرح کام کرتے ہوئے اسے ڈر نہیں لگتا۔ اور بھاگو اپنی موت کو وقت کے ہاتھ میں بتا کر کہانی کی گاڑی کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ جس طرح بھاگو پلیگ کے مریضوں کے درمیان آتا جاتا ہے، اس میں بھاگو کا دنیا سے وداع ہو جانا غیر فطری بات نہیں۔ لیکن تب کہانی یا تو اختتام کو پہنچ جاتی یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی۔ اس لیے اموات کے ہجوم میں بھی بھاگو کو زندہ رہنا ہے۔

- المیے کی شکل بھاگو کی بیوی کی موت میں ظاہر ہوتی ہے اور یہاں سے کہانی کا رخ بدل جاتا ہے۔ اب ڈاکٹر پلیگ منانے میں دن رات ایک کر دیتا ہے اور جلدی ہی پلیگ شہر کے لیے ماضی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ہماری توجہ کا مرکز بھاگو ہی بنتا ہے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر کا غرور اور صلے کی توقع ہے۔ یہ چیز بھاگو کے یہاں کسی منزل پر نظر نہیں آتی کیوں کہ سادگی اس کا زیور ہے۔
- راجندر سنگھ بیدی نے کم اہمیت کے مختلف کرداروں کو اپنی افسانہ نگاری سے یادگار بنا دیا ہے۔ ان کا پہلا اہم افسانہ 'بھولا' کا کردار ایک بچہ ہوتے ہوئے بھی اردو کی ادبی تاریخ میں ناقابلِ فراموش ہے۔ اسی طرح 'لاجونتی' ہندستانی ادب کا ایک یادگار کردار ہے۔ اسی طرح اس کہانی کی معرفت انھوں نے بھاگو کے کردار کو وضع کیا ہے۔ یہ بیدی کے ابتدائی افسانوں میں ہے اور ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'دانہ و دام' میں شامل ہے۔

آپ بتائیے

1. کوارنٹین افسانے میں کس وبا کا ذکر ہے؟
2. چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے والے اشتہار کے عنوان میں لوگوں نے کس بات کا اضافہ کیا؟
3. کوارنٹین افسانے کے کردار 'ڈاکٹر' کا اصول نام کیا ہے؟
4. کوارنٹین افسانے میں صفائی کا کام کرنے والے 'بھاگو' کا پورا نام کیا ہے؟
5. 'بھاگو' کے گھر پلیگ سے کس کی موت ہوئی؟
6. کوارنٹین کو 'دوزخ' کس نے کہا؟
7. وبا پر قابو پا لینے کے بعد ڈاکٹر کو کون سا عہدہ حاصل ہوا؟
8. بیدی کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام بتائیے۔
9. کوارنٹین افسانے کا مرکزی کردار کون ہے؟

مختصر گفتگو

1. کوارنٹین کس شے کا نام ہے؟
2. کوارنٹین زیادہ اموات کا باعث کیوں ہوئی؟
3. ڈاکٹر پلیگ سے اپنی حفاظت کے لیے کیا کام کرتا تھا؟
4. بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونت ل آبے) کیا کہتے ہیں؟
5. ڈاکٹر رفتارِ صحت کا نقشہ دیکھ کر کیوں خوش ہوتا تھا؟
6. ضرورت سے زیادہ برانڈی پینے کا ڈاکٹر پر کیا اثر ہوا؟

7. بھاگو کا بازو کیوں جل گیا؟
8. بھاگو ڈاکٹر کو پلیگ سے نہ ڈرنے کی کیا وجہ بتاتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. افسانہ 'کوارنٹین' کا خلاصہ لکھیے۔
2. ڈاکٹر کو اس کے فرض کی جانب راغب کرنے والے اسباب کیا تھے؟
3. کوارنٹین کی جو شبیہ افسانے میں پیش کی گئی ہے، اسے اپنے لفظوں میں قید کیجیے۔
4. ڈاکٹر کے عمل اور بھاگو کی کوششوں میں سے کس میں زیادہ انسانی دردمندی ہے؟ مدلل لکھیں۔

- درج ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی جنس واضح ہو جائے۔

گردن، میدان، صحت، شہر، موت، انتظام، صورت، شام، طبیعت، عرصہ، شراب، صفائی

- درج ذیل الفاظ کی ضد بتائیے۔

زیادہ، بیمار، قریب، خوب صورت، شام، خوش قسمتی، حیات، دوزخ، نیکی

- درج ذیل واحد الفاظ سے جمع بنائیے۔

وقت، رسم، مثوت، مرض، ترکیب، جذبہ، احساس، تصویر، قدر، تقریر، طبقہ، کلمہ، شخص، خیال، حد

آیئے، کچھ کریں

1. بیدی کے تین افسانوی مجموعوں کو اپنے اسکول یا کالج کی لائبریری سے تلاش کر کے اپنے پسندیدہ افسانوں کا مطالعہ کیجیے۔
2. 'راجندر سنگھ بیدی — ایک شش جہت شخصیت' عنوان سے اپنے اسکول میں مذاکرہ کیجیے۔

جے پرکاش نارائن

جے پرکاش نارائن 11 اکتوبر 1902 کو بہار اور اتر پردیش کی سرحد پر سریو اور گنگا ندیوں کے سنگم پر واقع ستاب دیارا گانو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ہرسو دیال تھا۔ گانو کی ابتدائی تعلیم کے بعد جے پرکاش نارائن پٹنہ کالجیٹ اسکول کی ساتویں جماعت میں داخل ہوئے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ انھیں سرکار کی طرف سے اسکالرشپ ملی اور انھوں نے سائنس مضمون کا انتخاب کیا۔ اس زمانے میں پٹنہ کالج میں آرٹس کے ساتھ سائنس کی بھی پڑھائی ہوتی تھی۔ 1920 میں اس وقت کے مشہور وکیل اور مجاہد آزادی برج کشور پرشاد کی صاحبزادی پربھاوتی سے شادی ہوئی۔

تحریک آزادی کی وجہ سے پٹنہ کالج چھوڑنا پڑا اور پھر کانگریس کے قائم کردہ ادارے بہار ودیا پیٹھ سے انٹرمیڈیٹ سائنس پاس کرنے کے بعد پروفیسر پھول دیو سہائے ورما سے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے بنارس پہنچے۔ 15 مئی 1922 کو اعلا تعلیم کے لیے جے۔ پی۔ امریکہ روانہ ہوئے۔ کیلی فورنیا اور شکاگو اور وس کانسن کے تعلیمی اداروں سے استفادہ کیا۔ اوہائیو (Ohio) یونی ورسٹی سے انھوں نے سماجیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ Social Vaniation موضوع کے تحت انھوں نے جو تحقیقی مقالہ جمع کیا۔ اسے اس سال کی سب سے بہترین تھیسس (Thesis) مانی گئی۔ 1929 کے ستمبر میں جے پرکاش ہندستان لوٹ آئے۔ 1930 میں جے پرکاش پہلی بار گرفتار ہوئے اور ناسک جیل میں 1933 تک رہے۔ 42ء آندولن میں انھیں گرفتار کیا گیا اور ہزاری باغ جیل میں بند رہے۔ دیوالی کے روز جے پرکاش نارائن جیل کی 17 فٹ اونچی دیوار کود کر بھاگنے میں کامیاب رہے۔ کہتے ہیں بھارت چھوڑو تحریک میں جس طرح سارے رہنما جیلوں کی سلاخوں میں ڈال دیے گئے تھے اگر جے پرکاش نارائن باہر نہیں آتے اور ایک سال تک اس تحریک کی قیادت ان کے ہاتھوں نہیں ہوتی تو شاید سنہ 42 کی تحریک ناکام ہوگئی ہوتی۔ انھیں آخر کار قید کرلیا گیا اور 18 ستمبر 1943 سے لاہور قلعے میں رکھا گیا۔ بعد میں انھیں لاہور سے آگرہ جیل منتقل کردیا گیا۔ 11 اپریل 1964 کو جے پرکاش جیل سے باہر آئے۔ 1975 میں ایمرجنسی لگتے ہی جے۔ پی۔ کو گرفتار کرلیا گیا اور 1977 میں ایمرجنسی اٹھنے تک ابتدا جیل اور پھر جیل اسپتال کے بستر پر رہے۔

جے۔ پی۔ آزادی کے بعد سیاسی منصب حاصل کرنے کی دوڑ سے الگ رہے۔ انھوں نے ملک کی تعمیر نو کی زمینی سچائیوں پر محنت کرنے اور اپنی تمام زندگی کو کھپا دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ آزادی کے بعد سرودے نامی تحریک اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے اس کے کارکن یہ احساس دلاتے رہے کہ گاندھی جی کے باقی ماندہ کاموں کو آگے بڑھانا جے۔ پی۔ نے اپنی ذمہ داری سمجھی تھی۔ مظفر پور ضلع میں نکسلیوں اور متعدد تشدد پسندوں کو جے۔ پی۔ نے سماج کے عمومی دھارے میں شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ تجربہ چمبل گھاٹی کے ڈاکوؤں پر بھی کیا اور کامیابی پائی۔ کشمیر میں انتشار پسندوں سے بات چیت کی صورت پیدا کرنے میں ساٹھ کی دہائی میں جے پرکاش نارائن نے کامیابی پائی۔

آزادی کے بعد، جب سیاسی منظرنامے پر ایک ایک کرکے ہمارے مجاہدین آزادی سیاسی مشنری کا حصہ ہو کر اپنی انقلاب پسندی سے الگ ہوتے چلے جارہے تھے، جے پرکاش نارائن نے 1974 میں بہار میں طالب علموں کی تحریک کی قیادت ہاتھ میں لے کر ایک کامیاب ملک گیر عوامی تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک ابتدا جمہوریت کے نام پر آمریت کے خلاف تھی۔ لیکن اس کے موضوعات اور دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور نہ جانے کتنی سماجی، سیاسی برائیوں کے خلاف نبرد آزما اس آندولن کا مقصد اولین بن گئی۔ جے۔ پی۔ کو اسی تحریک کے زمانے میں 'لوک نایک' کہا گیا اور پورا ملک اب انھیں یا تو 'لوک نایک' کہتا ہے یا ان کے مختصر نام 'جے۔ پی۔' سے یاد کرتا ہے۔

جے پرکاش نارائن سیاست اور سماج کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے کام میں بھی سرگرم رہے۔ انھوں نے انگریزی میں زیادہ لکھا۔ ٹوٹل ریولوشن (کامل انقلاب)، سرودے اور 'جیل ڈائری' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ 1974 تحریک کے دوران انھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں جو تقاریر کیں، انھیں بھی کتابوں اور کتابچوں کی شکل میں شائع کیا گیا۔ پٹنہ میں 8 اکتوبر 1979 کو ان کا انتقال ہوا۔

संपूर्ण क्रांति

کامل انقلاب

sampurna kranti

اس تحریک کو میں کامل انقلاب کی حیثیت سے دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی وجہ سے سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ آج جو ہمارا سماجی ڈھانچہ ہے، اس سے بالکل مختلف ڈھانچہ ابھرے گا جہاں ناپسندیدہ عناصر کی کم سے کم گنجائش ہوگی۔ ایک ایسے نئے ہندستان کی تعمیر ہماری کوشش ہے جہاں کا ہر باشندہ خوش اور مطمئن زندگی گزارے گا۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان وہ دوری نہیں ہوگی جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں، یہ ماضی کی بات ہو جائے گی۔ استحصال کا خاتمہ ہوگا یا کم سے کم گنجائش ہوگی۔ نئے ماحول میں سماجی برائیاں نہیں ہوں گی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ معاشی اعتبار سے ایک ایسا ڈھانچہ ابھرے گا جہاں سماج کے غریب اور کمزور طبقے کی فلاح و بہبود کو اولیت حاصل ہوگی۔ ہریجن، آدی باسی، مسلمان، زرعی مزدور، بے زمین کسان اور اسی طرح کے دوسرے پیشہ وروں کی حالت میں تبدیلی پر پہلے دھیان دیا جائے گا۔

اگر یہ تحریک کامیاب ہوتی ہے تو مجھے امید ہے کہ سماجی حیثیت سے نمایاں تبدیلیاں آئیں گی۔ سماجی برائیاں مثلاً چھوا چھوت، ذات پات وفرقہ واریت کو ختم ہونا ہے۔ ہم ہندستانی ہیں، ہم انسان ہیں، ان جذبوں کو مستحکم بنانا ہے، انھیں تقویت پہنچانی ہے۔ ہر آدمی

کے دل میں اسی جذبے کو ابھارنا ہے، اپنے عمل سے، اپنے کردار سے اس کی صداقت کو ثابت کرنا ہے، صرف باتیں نہیں بنانی ہیں۔ جب میں دور نظر ڈالتا ہوں تو سرودے، کمیونزم، سوشلزم سب کی ایک ہی منزل نظر آتی ہے، ہاں طریقے جدا ہیں، مختلف ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس تحریک کی منزل بھی وہی ہو، یعنی کامل انقلاب۔

یہ انقلاب اسی وقت کمال کو پہنچے گا جب ہم اپنے سماجی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ سماجی برائیوں کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔ میں نے طلبہ سے کہا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو یہ لعنت ہے، اسے ختم کرنا ہے۔ آپ کو مثلاً جہیز کی کہیں گے کہ لڑکوں کے باپ تلک، جہیز مانگتے ہیں، جب تک ہم اپنے لڑکوں کے لیے تلک نہیں لیں گے تو اپنی لڑکیوں کی شادی کے وقت کہاں سے دیں گے، لڑکوں کے باپوں کی مانگ کو کیسے پوری کریں گے؟ مجھے لڑکوں اور لڑکیوں کے والدین سے کہنا ہے کہ آپ کی اولاد

جانور نہیں، گھوڑے بیل نہیں کہ اس کا سودا کیا جائے، یہ تو نہایت ہی شرم کی بات ہے۔

ہمارا معاشرہ اور خاص کر قدیمی معاشرہ مختلف رہا ہے۔ سیتا نے رام چندر جی کو اپنا خاوند چنا، پہلے سوئمبر ہوا کرتے تھے۔ جہاں لڑکیاں اپنے شوہر منتخب کرتی تھیں۔ آج لڑکیوں کے والدین لڑکوں کے والدین کو پہلے راضی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ پہلے لڑکوں کو راضی کریں تب میں کچھ کر سکوں گا، لڑکوں سے بات کرو، تو اچھی لڑکی بھی انھیں چاہیے اور باہر جانے کے اخراجات کے علاوہ امبسڈر گاڑی بھی۔ کوئی ان بدبختوں کو بتلائے کہ تمھیں لڑکی سے شادی کرنی ہے یا گاڑی سے، تم اپنی بیویاں چن رہے ہو یا سائیکل — ہم معاشرتی لحاظ سے اتنا پست ہو گئے ہیں کہ سوچ نہیں سکتے۔ میں نوجوانوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی شادی کے وقت تم جہیز تلک چاہو گے، نوجوانوں کے اندر اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ وہ کہیں، نہیں۔ تلک جہیز کی لعنت ختم ہونی چاہیے۔ میں نوجوانوں سے کہوں گا کہ تم اپنی ذات سے باہر شادی کرو۔ ہم نے ذات اور گوتر جیسی لعنت کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اونچ نیچ کے تفرقے کو لازمی طور پر ختم کیا جانا چاہیے۔ کامل انقلاب کا نظریہ اس وقت تک پورا نہیں کیا جا سکتا جب تک سماج میں اس طرح کے تفرقے موجود ہوں گے۔

ابھی چل رہی تحریک کا مقصد وزارت کو ختم کرنا یا اسمبلی کا توڑنا قطعی نہیں ہے۔ اس کی منزل کامل انقلاب ہے، پورے طرز زندگی کے اندر بنیادی تبدیلی لانی ہے۔ ایک چیز میں تبدیلی لانے سے معاشرے کا نظام مکمل نہیں ہوتا، اس کی تکمیل کا تقاضا ہے کہ زندگی کے ہر بنیادی پہلو میں بہتر تبدیلی لائی جائے۔ اگر سماج کے ایک عنصر کی اصلاح کی جاتی ہے اور باقی کو اس کی پراگندہ حالت میں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس جزوی اصلاح کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لیے مکمل اصلاح کا تقاضا ہے کہ ہر پہلو سے معاشرے کی صفائی ہو، ورنہ اچھائی پر برائی حاوی ہی رہے گی اور جو اچھے مستقبل کا خواب ہم دیکھ رہے ہیں، وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ پورے معاشرے کی اصلاح کے لیے ہم قدم اٹھائیں، ٹکڑوں میں اسے بانٹیں نہیں۔

ہماری منزل بہت اہم ہے لیکن ہے وہ کافی دور۔ ہمارا مقصد صالح جمہوریت ہے، عوام کی حکومت بنانی ہے، استحصال کو ختم کرنا ہے اور تنگ دلی اور تفرقات کی دیواروں کو مسمار کر دینا ہے، ایک نئے ہندستان کی تعمیر کرنی ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن جب عزم مستحکم ہو تو منزل کا ملنا لازمی امر ہے۔ ہمیں منزل ضرور ملے گی کیونکہ ہم نے نیک نیتی سے معاشرے کو صالح بنیادوں پر کھڑا کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔ ہمیں افراد کو بدلنا ہے اور ساتھ میں سماج کو بھی۔ ایک ایسا سماج جہاں فرد سماج کے لیے جیتا ہو، اس کا بنانا مشکل کام ہے لیکن ہماری کوشش ایسی منزل تک پہنچنے کی ہے۔ انقلاب ایک دن میں نہیں آتا لہٰذا ہم آگے کی طرف قدم بہ قدم بڑھتے جائیں گے۔

میں لگاتار گاندھی کے راستے پر زور دے رہا ہوں، آپ اسے میرا خبط کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میں کسی پر کوئی چیز زبردستی لادتا نہیں۔ عوامی جدوجہد کی اسٹریٹجی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہم پُرامن راہ کو ہی اپنائیں۔ آپ کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے کہ آپ کتنے پُرامن ہیں۔ اگر آپ ایک تشدد کریں گے تو مدِ مقابل سو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ذہن سے تشدد کی بات کو بالکل نکال دیں۔ یہ تحریک صالح جمہوریت کے قیام کے لیے ہے اور صالح جمہوریت تشدد اور ڈنڈوں کے زور پر قائم نہیں کی جا سکتی، امن کا خیال رکھے بغیر یہ ناممکن ہے۔ یہ گاندھی وادی جے پرکاش کا خبط نہیں۔ امن وقت کا تقاضا ہے۔ اگر کل لاٹھیوں کے زور پر چنا ہوئے تو اس کی بنیاد پر کیسی جمہوریت سامنے آئے گی؟ کیا ڈنڈوں کے زور پر بنی ہوئی جمہوریت صالح ہوگی؟ بغیر امن کے جمہوریت صالح اور پایدار ہرگز نہیں ہو سکتی۔ امن اور جمہوریت ایک سکّے کے دو پہلو ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ان کا وجود ممکن نہیں۔

چوں کہ مجھے جمہوریت میں یقین ہے، لہٰذا مجھے تشدد میں یقین نہیں۔ مجھے عوام کی صلاحیت پر بھروسہ ہے، اس لیے میں قطعی نہیں چاہتا کہ چند بندوق بردار عوام کے کاندھوں پر سوار عوام کے نام پر حکومت کریں۔ جو لوگ عوام کی صلاحیت پر بھروسہ نہیں کرتے، وہی تشدد اور بدامنی کی بات کرتے ہیں، یا جو لوگ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ تشدد کی راہ اپناتے ہیں۔ جہاں عوام بے دار

ہوجاتے ہیں، وہاں تشدد نقصان دہ اور بے معنی چیز ہوجاتی ہے اور جہاں عوام بے دار نہیں، وہاں تشدد بے رحم اور سفاک ہوجاتا ہے۔

تاریخِ عالم کے پرتشدد انقلابوں کی تاریخ پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ وہ انقلاب لمبے عرصے کی جدوجہد کے نتائج تھے، نئے طرز پر عمل کرنے میں کافی عرصہ لگا اور رفتار بہت دھیمی رہی۔ پرامن انقلاب میں ڈھانچہ کی تبدیلی اور نئے طرز پر عمل ساتھ ساتھ چلا کرتے ہیں، اس طرز کی یہ خوبی ہے۔ تاریخی شواہد کی بنیاد پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر پُرتشدد انقلاب خدانخواستہ ہندستان میں آتا ہے تو اسے کافی عرصہ لگے گا لیکن پرامن انقلاب فوری لایا جاسکتا ہے اور وہ تو آچکا ہے۔

جب تک پورا سماج تیار نہیں ہوتا، انقلاب رونما نہیں ہوتے، یہ انقلاب کے سائنس کا ایک اہم اصول ہے۔ سماج میں جب تضاد کا دور دورہ ہوجاتا ہے تو انقلاب کی زمین تیار ہوتی ہے۔ جب سماجی مسائل تکلیف دہ حد تک پہنچ جاتے ہیں تب عوام کی بے چینی نئے حالات کو جنم دیتی ہے اور جیسا کہ مارکس نے کہا کہ کوانٹیٹی کوالیٹی میں بدل جاتی ہے۔ مسائل حالات میں نمایاں تبدیلی کے باعث ہوجاتے ہیں۔ بدعنوانی کے سلسلے میں آج وہی صورتِ حال ہے۔ اس نے حالات میں نمایاں تبدیلی لادی ہے اور انقلابی تبدیلیوں کے لیے زمین تیار ہوچکی ہے۔ یہ تبدیلی آنے والی ہی ہے ورنہ یہ سماجی ڈھانچہ ہی ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا۔

انقلاب کسی انقلابی رہنما کا مرہونِ منت نہیں ہوا کرتا۔ نہ لینن، ماؤ اور نہ گاندھی نے ہی ایسا کر دکھایا ہے۔ انقلاب تو سماجی حالت اور تاریخ کی کوکھ سے ابھرتا ہے۔ انقلابی رہنماؤں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت کے دھارے کو پہچان لیتا ہے۔

ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اپنی پوری طاقت سے عدم تشدد کی راہ اپنا کر مسائل کے حل کی تلاش کریں۔ ہمیں اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنی ہوں گی اور اس سے بہتر حاصلِ زندگی یا کوئی منزل نہیں ہوسکتی ہے۔ انقلابی فوج کی ریڑھ کی حیثیت ان انقلابیوں کی ہوگی جنھوں نے انقلاب کے لیے اپنے کو وقف کردیا ہے اور یہ کام آسان نہیں، زندگی کو داؤ پر لگانا ہے۔

ہم آج ایک تاریخی موڑ پر کھڑے ہیں۔ صدیوں سے برابری، آزادی اور اخوت کے دیکھے جاتے خواب ہم سے کچھ تقاضے کررہے ہیں۔ بغیر اسٹیٹ کی حکومت کا خواب ابھی پورا ہونا باقی ہے۔ ہر کسی کو اپنی صلاحیت کے مطابق اور ہر کسی کو اپنی ضرورت کے لائق والے اصولوں پر ابھی تک عمل نہیں ہوسکا ہے۔ حالات متقاضی ہیں کہ اب ان پر عمل ہو اور انسانیت کا ایک اہم پہلو سرخروئی کی منزل تک پہنچے۔ گاندھی جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دوسرے انقلاب نے سماج کے صرف خارجی مسائل کو حل کیا جب کہ ان کے ذریعے لائے انقلاب کا مقصد دوہرا ہے۔ ان کا انقلاب انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرے گا، انسان کے سوچنے کے طریقے میں نمایاں تبدیلی لائے گا، اس کے بعد سماج میں بنیادی تبدیلی لانے کی کوشش ہوگی۔ یہ انقلاب روحانی ہوگا۔

اپنے ملک کو اسی طرح کے انقلاب کی ضرورت ہے۔ لیکن کون آگے آئے گا، کون ملک کے لیے قربانی دینے کو تیار ہے؟ اس ملک کی روح کو نوجوانوں نے بہت تقویت پہنچائی ہے، نوجوان ہی یہاں کی روحانیت کے علم بردار رہے ہیں، بزرگوں نے قیادت نہیں کی ہے، کارزارِ حیات کی گہما گہمی میں کرشن نے اپنی روحانیت کی بنسری بجائی۔ کرشن جوان تھے۔ جب سدھارتھ نے اپنی حسین بیوی اور معصوم نوزایدہ بچے راہل کو چھوڑ کر روحانیت کی راہ اپنائی، وہ جوان تھے، رگوں میں جوش مارتا خون دوڑ رہا تھا۔ انھوں نے ایک روحانی انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ ادویت فلسفہ کے بانی شنکر اچاریہ نے اپنی اٹھتی جوانی کے دنوں میں روحانیت کا پرچار شروع کیا۔ جب سوامی وویکانند نے ویدانت کا فلسفہ شکاگو کے امریکی ماحول میں عالمی برادری کے سامنے رکھا تو وہ جوان ہی تھے۔ گاندھی جی نے جب جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف جہاد چھیڑا، اس وقت وہ نوجوان تھے۔ دکھن افریقہ کے ہندستانیوں کے درمیان زندگی کی روح انھوں نے پھونکی۔ دوستو! روحانیت نوجوانوں کی قوتِ پرواز چاہتی ہے، لڑکھڑاتے ہوئے بڑھاپے کی یہاں اتنی اہمیت نہیں۔

لفظ و معنی

زرعی مزدور - کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور

فرقہ واریت - تعصب اور تنگ نظری، اپنے مذہب یا گروہ کی طرف داری اور دوسروں کی مخالفت

کمیونزم - اشتمالیت، ایک انقلابی نظریہ حیات جو نجی ملکیت کے خلاف ہے۔ اس کی رو سے ملک کے تمام وسائلِ پیداوار پر ریاست (عوام) کا قبضہ ہونا چاہیے اور ہر فرد کو اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملنا چاہیے۔

سوشلزم - اشتراکیت، ساجھا، شرکت، ایک اعتدال پسند نظریہ حیات جس کے مطابق ذرائع پیداوار پر عوام کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیے۔

بیخ کنی کرنا - جڑ سے اکھاڑنا، نیست و نابود کرنا

گوتر - خاندان

تفرقہ - پھوٹ، اختلاف

پراگندہ - پریشان، حیران، منتشر

مسمار کرنا - ڈھا دینا

مستحکم - مضبوط

مصمّم - پکّا، مضبوط

خبط - جنون، دیوانگی

بدامنی - گڑبڑ، بغاوت

سفّاک - ظالم

مرہونِ منت - احسان مند، شکر گزار

متقاضی - تقاضا کرنے والا، مانگنے والا

کارزارِ حیات - زندگی کی لڑائی

آپ نے پڑھا

- پیشِ نظر تقریر جے۔ پی۔ کے کامل انقلاب کے تصوّر کو واضح کرتی ہے۔ سماجی برائیوں سے لڑنے کی بات اور انقلاب میں رہنماؤں کے رول پر بھی وہ روشنی ڈالتے ہیں۔ تشدّد اور عدم تشدّد کی وضاحت بھی اس تقریر میں موجود ہے۔
- جے۔ پی۔ بتاتے ہیں کہ کمیونزم اور سوشلزم کی منزل ایک ہی ہے۔ موجودہ سماج سے بہتر سماج کی تشکیل کسی بھی انقلاب کا مقصد ہوتی ہے۔ جے۔ پی۔ کہتے ہیں کہ انقلاب شخصِ خاص کا کرشمہ نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کی اپنی ضرورتوں سے جنم لیتا ہے۔ سماج میں جب بدامنی کا دور دورہ ہو اور نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو انقلاب کے لیے ماحول تیار ہونے لگتا ہے۔ وہ مشہور انقلابی رہنما لینن اور 'ماؤ' کا نام لیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ یہ لوگ محض نباض تھے نہ کہ حالات کو جنم دینے والے۔
- جے۔ پی۔ کے سوشلسٹ اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ 'بغیر اسٹیٹ کی حکومت قائم ہو' اور 'ہر کسی کو اپنی صلاحیت کے

مطابق کام ملے اور ہر کسی کو اپنی ضرورت کے مطابق دام ملے۔' آپ نے علم سیاسیات کی کتاب میں اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ ان اجزا میں 'خودمختاری' کا بھی ذکر آتا ہے۔ مارکس نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ جب پوری دنیا میں اشتراکی انقلاب آجائے گا تو مختلف ممالک کی سرحدیں نہیں ہوں گی بلکہ بین الاقوامی حکومت ہوگی۔ اور پوری دنیا کے لوگ ایک ہی ملک کے باشندے ہوں گے۔ اسی اسٹیٹ میں یہ بھی ممکن ہوسکے گا کہ ہر شخص وہی کام کرے جس کی اس میں صلاحیت ہے اور اسے اس کے لیے اتنی مزدوری دی جائے جو اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکے۔

آپ بتائیے

1. کامل انقلاب کا تصور کس نے پیش کیا؟
2. جے۔ پی۔ کس رہنما کے راستوں پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں؟
3. جمہوریت میں یقین ہونے کی وجہ سے جے۔ پی۔ کا کس چیز میں یقین نہیں ہے؟
4. کس انقلاب میں تبدیلی کی رفتار بڑی دھیمی رہی ہے؟
5. 'کوانٹیٹی، کوالیٹی میں بدل جاتی ہے۔' کس نے کہا ہے؟
6. ویدانت کا فلسفہ وویکانند نے امریکہ کے کس شہر میں پیش کیا تھا؟

مختصر گفتگو

1. کامل انقلاب کے بعد کون کون سی تبدیلیاں واقع ہوں گی؟ سبق کے حوالے سے جواب دیں۔
2. جے پرکاش نارائن نے بلا جہیز شادی کے لیے کیا دلیلیں دی ہیں؟
3. 'امن اور جمہوریت ایک سکّے کے دو پہلو ہیں'۔ جے پرکاش نارائن کیسے اس نتیجے تک لے جاتے ہیں؟
4. جے۔ پی۔ پرتشدد انقلاب پر پُرامن انقلاب کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1. انقلابی رہنماؤں کی کیا خصوصیت ہوتی ہے؟
2. تشدد کی راہ کون لوگ اپناتے ہیں؟
3. انقلاب کی سائنس کا کیا اصول ہے؟
4. تحریک کی کامیابی سے سماج کی کون سی برائیاں ختم ہوں گی؟

آیئے، کچھ کریں

1. جے۔ پی تحریک کے وقت ملک میں کس طرح کے حالات تھے اور اس تحریک کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ استاد سے معلوم کیجیے۔
2. بہار کے مشہور سیاسی رہنماؤں کی تصویریں جمع کیجیے اور انھیں ایک البم میں سجایئے۔

جوش ملیح آبادی

اصل نام شبیر حسن خاں اور تخلص جوش ہے۔ تقریباً 1896 میں ملیح آباد (لکھنؤ) سے متصل قصبے کنول ہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر احمد خاں، دادا محمد احمد خاں اور پردادا فقیر محمد خاں گویا سبھی شاعر تھے۔ ان میں گویا شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ جوش نے اپنے گھر پر اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد لکھنؤ، علی گڑھ، سیتا پور اور آگرہ کی مختلف درس گاہوں میں سینئر کیمبرج تک کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی شادی 1914 میں محمد مقیم خاں کی بیٹی اشرف جہاں بیگم سے ہوئی۔

والد کے انتقال کے بعد جوش معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔ علامہ اقبال نے مہاراجا شری کشن پرشاد کو ان کے لیے سفارشی خط لکھا۔ مہاراجا کی کوششوں سے انھیں حیدر آباد کے دارالترجمہ میں ملازمت مل گئی۔ ان کا ذہن باغیانہ تھا۔ ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود وہ جاگیر دارانہ نظام کے سخت مخالف تھے۔ اسی مزاج کے چلتے انھوں نے نظام حیدر آباد کے خلاف نظم کہی جس کے نتیجے میں حیدر آباد سے ان کا اخراج ہوا۔

آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے لیکن وہاں انھیں ذہنی آسودگی نصیب نہیں ہو سکی۔ ان کی زندگی کے آخری دن بڑے کرب و انتشار میں گزرے۔ 22 فروری 1982 کو ان کا انتقال ہوا۔ نظم و نثر میں دو درجن کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ان میں روحِ ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، حرف و حکایت، آیات و نغمات، قطرہ و قلزم، الہام و افکار، سیف و سبو اور یادوں کی برات (خودنوشت) زیادہ اہم ہیں۔

BSTBPC-2018

جوش ملیح آبادی

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زِنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی؟ زیروزبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی؟ سینوں سے جو خون چُرایا کرتے تھے
اِک روز اُسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی؟ ہونٹوں پر جو قُفل چڑھایا کرتے تھے
اِک روز اُسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو! کہ وہ زِنداں گونج اٹھا، جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گیا
اُٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

لفظ و معنی

زِندان	-	قیدخانہ
تکبیر	-	اللہ اکبر کہنا
تلاطم	-	جوش، ولولہ

گدا - فقیر

زیروزبر - الٹ پلٹ

مارِسیہ - کالا سانپ

ملّت - دین، مذہب، فرقہ

قفل - تالا

آپ نے پڑھا

- ہندستان کی آزادی کی تحریک جوش نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ آزادی کے متوالوں کو توپوں کے دہانوں کے آگے سینہ پر دیکھا۔ اسیرانِ زنداں کی آہ و بکا ان کی سماعت کے پردے سے گزری۔ آخر وہ دن بھی دیکھا جب زِنداں کی دیواریں زمیں بوس ہوگئیں اور ظالم و جابر حکمرانوں کے چہرے، تکبیروں کی گونج، اور ولولہ انگیز دہکتی تقریروں کے آگے بے نور پڑ گئے۔
- اس نظم میں جوش نے اپنے عینی مشاہدات کو مختلف تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔
- پوری کی پوری نظم بلند بام حوصلے،، پر جوش اندازِ بیان، رگوں کے خون میں تلاطم پیدا کرنے والی ولولہ انگیز تقریر سے لبریز ہے۔

آپ بتایئے

1. 'شکستِ زنداں' کا خواب کس کی نظم ہے؟
2. جوش کا اصل نام کیا ہے؟
3. زندانی سے کیا مراد ہے؟
4. جوش کی پانچ تصانیف کے نام بتایئے۔
5. شِکستِ زنداں کا خواب کی تعبیر کیا ہے؟
6. جوش کے ہم عصر تین شعرا کا نام بتایئے اور ان کے مجموعۂ کلام کا نام بھی لکھیے۔

مختصر گفتگو

1. کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے کہ شاعر کے تخلّص 'جوش' اور ان کے شعری مزاج سے کوئی مناسبت ہے؟
2. زنداں پر رعشہ طاری ہونا، زنجیروں کا ٹوٹنا، دیواروں کے نیچے قیدیوں کا جمع ہوکر آزادی کا پرچم لہرانے کی تدبیریں کرنا، یہ ساری باتیں کس تحریک کا پتا دے رہی ہیں؟
3. جب آزادی کے دیوانے، پروانے حرکت میں آجاتے ہیں تو سلطانِ وقت (قوم افرنگ) کا چہرہ بے نور کیوں ہوجاتا ہے؟
4. کیا ان کو خبر تھی؟ زیروزبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو اُبلیں گے زمیں سے مارِسیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

درج بالا شعر کی تشریح کیجیے

(i) مارسیہ کا معنی بتایئے۔

(ii) ملک اور شمشیر کا مترادف بتایئے۔

(iii) ملّت کو زیر و زبر کون رکھتے تھے؟

تفصیلی گفتگو

1. اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
2. جوش کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
3. جب سینوں میں بجلی کا تلاطم اور آنکھوں میں شمشیرِ بے نیام کی چمک آ گئی تو توپوں کے دہانے ٹھنڈے کیوں پڑ گئے؟
4. جب زبانوں اور انگلیوں پر تقریر و تحریر کی پابندی لگ گئی تو ایک دن وہ ان فرنگی بندشوں سے آزاد ہو کر ظالم و جابر حکمرانوں کا تختہ پلٹنے کے لیے آمادہ کیسے ہو گئیں؟
5. پہلے مصرعے کا جزِ واوّل 'کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے' صرف ہندستان ہی کی تحریکِ آزادی کی یاد دلا رہا ہے یا مختلف ممالک کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ اس ضمن میں تحریکِ فرانس، آزادیِ روس و امریکہ اور دیگر عرب ممالک کی آزادی کے سلسلے میں اپنے اساتذہ سے معلومات فراہم کریں۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے معلوم کیجیے کہ نظم 'شکستِ زنداں کا خواب' جوش کی کس تصنیف سے اخذ کی گئی ہے؟ اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔
2. جوش کی پُر جوش نظموں کی فہرست تیار کیجیے اور ان کا مطالعہ کیجیے۔

مجاز لکھنوی

اسرار الحق مجاز 19 اکتوبر 1911 میں ردولی جیسے مردم خیز قصبے کے محلّے خواجہ حال میں پیدا ہوئے۔ یہ متوسّط درجے کا زمین دار گھرانہ تھا جو معاشی فکر سے بے نیاز تھا۔ ان کے والد کا نام سراج الحق اور دادا کا چودھری احمد حسین تھا۔ مجاز کے والد اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے سرکاری نوکری حاصل کی۔

مجاز کا بچپن بڑے لاڈ پیار میں گزرا۔ وہ بچپن میں پوری پوری رات جاگ کر گزار دیتے اس بنا پر لوگ انھیں جگن کہنے لگے۔ یہ ایّام طفولیت سے ہی حسن کے شیدائی، بے حد ذہین اور حسّاس تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ بعد میں یہ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے جہاں امین آباد ہائی اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ اسی وقت ان کے والد اسسٹنٹ رجسٹرار ہو کر آگرہ چلے گئے۔ چنانچہ مجاز نے 1929 میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ یہیں ان کا رابطہ آل احمد سرور، جذبی اور فانی بدایونی سے ہوا اور شعر و شاعری کی جانب ان کی طبیعت مائل ہونا شروع ہوئی۔ انھوں نے کچھ غزلوں پر فانی سے اصلاح بھی لی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں ناکام ہونے پر علی گڑھ آئے اور آرٹس میں داخلہ لیا۔ 1935 میں انھوں نے بی۔ اے۔ پاس کیا۔ ایم۔ اے۔ میں داخلہ تو ضرور لیا لیکن امتحان میں شریک نہیں ہو سکے۔

علی گڑھ یونی ورسٹی کی فضا مجاز کو بہت راس آئی۔ یہاں انھوں نے اپنی بہترین نظمیں لکھیں اور وہ ہر حلقے میں مقبول ہو گئے۔ ان کی رِندانہ زندگی کی ابتدا بھی علی گڑھ سے ہی ہوتی ہے۔ وہ 1935 میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے اور دہلی چلے آئے۔ وہ ریڈیو کے ترجمان 'آواز' کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ طبیعت کی بے اعتدالی اور کام کے تئیں بے اعتنائی کی وجہ سے ایک سال کے اندر ہی اس ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسی مدّت میں انھوں نے ایک خاتون سے عشق کا روگ پال لیا۔ اس میں ان کی بدنامی بھی ہوئی۔ کچھ دنوں بعد وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ لکھنؤ اس وقت ترقّی پسندی کا اہم مرکز بن چکا تھا۔ جس نے مجاز کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن مجاز کی شراب نوشی اور عشق میں مسلسل ناکامی نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ 1940 میں ان پر نروس بریک ڈاؤن کا پہلا حملہ ہوا۔ چند برسوں بعد اس طرح کا دوسرا حملہ ہوا۔ اس حملے سے سنبھلے تو بمبئی گئے۔ ہندستان آزاد ہوا تو بمبئی کی سڑکوں پر وہ ناچے گائے۔ 1951 میں انھوں نے پاکستان کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1952 میں تیسری مرتبہ جنون کا دورہ پڑا۔ رانچی کے پاگل خانے میں ان کا علاج ہوا جہاں وہ دس مہینے رہے۔ 3 ستمبر 1955 کو ایک شراب خانے کی چھت پر انھیں ڈبل نمونیہ ہو گیا اور دماغ کی نسیں پھٹ گئیں۔ 5 دسمبر 1955 کو اسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

1938 میں مجاز کا مجموعۂ کلام 'آہنگ' طبع ہوا تھا جو بے حد مقبول ہوا۔

آوارا

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے، کب تک در بہ در مارا پھروں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی!
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

یہ روپہلی چھانو یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی؟ یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن، تو پھر اے دوست! ویرانے میں چل
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر، مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیے
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پاسکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

جی میں آتا ہے، یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں، اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں، اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

لفظ و معنی

ناشاد	۔	ناخوش
ناکارا	۔	نکما، بے کار
دربدر	۔	جگہ جگہ
موہنی	۔	نہایت خوب صورت عورت
روپہلی	۔	چاندی کے رنگ کی
صوفی	۔	متقی اور پارسا شخص
رعنائی	۔	خوش نمائی، حسن، خوش خرامی
وا	۔	کھلا ہوا
سینے کا زخم مہک اٹھنا	۔	مصیبت کی انتہا ہونا
جابر	۔	ظالم، جبر کرنے والا
شبستاں	۔	بادشاہوں کے سونے کا کمرا
قصر	۔	محل

آپ نے پڑھا

- شہر کی رات اپنی رونقوں اور نظاروں سے کسی کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔ ہر کوئی اپنے دل کی حالت کے مطابق ہی اس کے تئیں اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ کسی کے لیے ایسی رات حسین اور مہربان ہے تو کسی کے لیے یہی سنگین اور مشتعل کرنے والی رات بن جاتی ہے۔ آپ نے ایک ایسی ہی رات میں ایک ایسے شاعر کے ردِعمل کا مشاہدہ کیا جو بار بار اپنے دل کے غم اور اس کی وحشت سے مخاطب ہے۔ وہ جس کشمکش میں مبتلا ہے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جگمگاتی جاگتی سڑکیں، جھلملاتے قمقمے، آکاش پر تاروں کا جال اور کسی ٹوٹے تارے کی پھلجھڑی۔ غرض کہ شہر کی رات کا ہر مظہر اسے مشتعل کرتا ہے۔ خود رات بھی اسے رسوائیوں کو اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔
- شاعر اسی صورتِ حال کی شدید گرفت میں ہے۔ وہ اپنے غم اور اپنی وحشت کے اسباب پر محض اشارے کرتا ہے۔ اپنے اندرونی غصے، تلملاہٹ، پچھتاوے، پشیمانی، اندوہ ناکیوں کی مختلف شکلیں ہی اس نے تخلیق کی ہیں، جن کی جلوہ گری نظم کے ہر بند میں تیز و تند لب و لہجہ کے ساتھ زندہ اور متحرک محسوس کی جا سکتی ہے۔
- شاعر جسے رکنا اور واپس ہونا پسند نہیں اور جس نے ہر مصیبت سے وفا کا عہد کر رکھا ہو، اس کے لیے رات کی سنگین صورتِ حال اور اس کی ترغیب مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنا عہد توڑ دے۔ عہد توڑنے کے خیال کے ساتھ ہی وہ کیا کر سکتا ہے یا کرے گا، اس کے متعلق وہ اپنے ارادے کا اظہار کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اور اس کا ارادہ ایک محل اور اس کی آڑ سے نکلنے والے پیلے ماہتاب کی طرح ہو اور اس کو اپنا ارادہ ملا کے عمامہ، بنیے کی کتاب، مفلس کی جوانی اور بیوہ کے شباب کی طرح پھیکا، بے جان، بے بضاعت اور بے توقیر نظر آتا ہو۔ ارادے کی تصویر کشی میں ابہام کے باوجود، نظم کے اگلے بندوں سے اس کی شکلیں واضح ہو جاتی ہیں۔ مردہ نظام کو مکمل طور پر ختم کرنے (ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں) اور مفلسی اور اس کے مظاہر کے ساتھ ہی جابر سلطان کی قہاریت ختم کرنے (تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں) کی طاقت اور ارادے کے اظہار کے ساتھ نظم اختتام کو پہنچتی ہے اور ذہن پر دور رس اور دیرپا اثر ڈالتی ہے۔

آپ بتائیے

1. کیا شاعر سڑکوں پر آوارا پھر رہا تھا؟
2. وہ کسے موتی کی لڑی کہتا ہے؟
3. کیا رات اسے ویرانے میں چلنے کی دعوت دیتی ہے؟
4. ایک طوفانِ بلا کس کے لیے منتظر ہے؟
5. کیا وہ سارا قصرِ سلطاں پھونک دینا چاہتا ہے؟

6. کیا آوارہ ایک پراثر نظم ہے؟
7. کیا اس نظم کا عنوان درست ہے؟
8. کیا مجاز ایک ترقی پسند شاعر تھے؟
9. کیا اردو کی رومانی شاعری میں ان کا نام روشن ہے؟

مختصر گفتگو

1. رات ہنس ہنس کر شاعر سے کیا کہتی ہے؟
2. اس نظم میں اس کا کردار کیسا ہے؟
3. 'اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب'۔ شاعر نے یہ بات کیوں کہی؟
4. وہ کن چیزوں کو نوچ لینا چاہتا ہے؟
5. عصرِ حاضر کے چنگیز کے ساتھ وہ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے؟
6. شاعر نے خود کو ناشاد اور ناکارا کیوں بتایا؟
7. اس کے دل میں غم اور وحشت کیوں ہے؟
8. رات کے وقت شہر کے کیا کیا منظر ہوتے ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1. نظم کے اوّلین بندوں میں شاعر نے رات کی کیسی تصویر ابھاری ہے؟
2. اس نظم کی شاعرانہ خوبیاں واضح کریں۔
3. اس نظم کا خلاصہ تحریر کریں۔
4. اس نظم کی روشنی میں مجاز کی شاعری پر اظہارِ خیال کریں۔

آیئے، کچھ کریں

1. مجاز کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیجیے۔
2. مجاز کے ہم عصر شعرا کی فہرست اپنے استاد کی مدد سے تیار کیجیے اور ان میں سے جن کا کلام آپ کو پسند ہو، انھیں پڑھیے۔

ولی

ولی اردو کا ایسا قدیم شاعر ہے جس کے نام، وطن اور سنہ پیدایش و وفات سب کے بارے میں اختلاف ہے اور اردو تحقیق کی اتنی ترقی کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ان کے مفصل حالات بھی دستیاب نہیں۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے انھیں مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔

گجراتی محققین کے مطابق ولی کا پورا نام شاہ ولی اللہ اور جاے پیدایش احمد آباد ہے اس نے مدرسہ ہدایت بخش میں شیخ نورالدین سے تعلیم پائی اور 1707 میں وفات پائی لیکن حیدرآبادی علما کے خیال میں شاعر کا اصل نام سیّد ولی محمد اور مقامِ پیدایش اورنگ آباد ہے۔ مدرسہ ہدایت بخش کی تعلیم، استاد کے نام اور تاریخِ وفات سے حیدرآبادی علما بھی متفق ہیں۔

مختلف محققین کی آرا کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ولی کا پورا نام ولی محمد تھا۔ اس کی جاے ولادت و وفات اورنگ آباد ہے۔ اس نے مدرسہ ہدایت بخش میں تعلیم پائی تھی، اسے گجرات سے بھی ایک طرح کا لگاؤ تھا۔ جس کا اظہار اس کے کئی اشعار سے ہوتا ہے۔ شہر سورت کے بارے میں اس نے ایک مثنوی بھی لکھی۔ وہ اپنی زبان دکنی بتاتا ہے:

دکنی زباں میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا کوئی یک شعر خوش تر زین نمط

ولی سیّاح صفت انسان تھا۔ اس نے اپنے دوست سید ابوالمعالی کے ساتھ دلّی کا سفر کیا تھا اور بعض تذکروں کے مطابق اس کی ملاقات شاہ سعداللہ گلشن سے بھی ہوئی تھی۔ 'تذکرہ گلشن گفتار' کے مطابق ولی نے حجِ بیت اللہ کیا تھا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔

ولی کا سالِ وفات 1707 تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا کہ وہ 1720 تک زندہ تھا۔ ولی کے ایک شاگرد ثناءاللہ نے 'دیوان ولی' کا ایک مخطوطہ 1725 میں لکھا تھا۔ اس میں انھیں مرحوم لکھا ہے، اس لیے ولی کا سنہ وفات 1720 اور 1725 کے درمیان ہونا چاہیے۔

غزلیں

(۱)

اگر باہر اپس کے گھر سوں موہن یک قدم نکلے
تماشا دیکھنے اس کا ہر اک سینے سوں غم نکلے

ترے مکھ کے گلستاں کی اگر حوراں میں شہرت ہو
تو ہر اک مست ہوکر چھوڑ گل زارِ ارم نکلے

اگر اے رشکِ چیں جاوے تو کرنے سیرِ ملکِ چیں
تو ہر دیول سوں استقبال کوں تیرے صنم نکلے

فجر کے وقت گر دلبر چلے حمام کی جانب
تو جیوں سورج ہر اک کے دل سوں یک چشمہ گرم نکلے

ولی سودا زدہ دل کی حقیقت گر سکوں لکھنا
تو دیوانہ ہو سا نکل پگ میں باہر یک رقم نکلے

(۲)

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

پی کے بیراگ کی اُداسی سوں
دل پہ میرے سدا اُداسی ہے

اے صنم! تجھ جبیں اُپر یہ خال
ہندوے ہردوار باسی ہے

زُلف تیری ہے موج جمنا کی
تِل نزک اُس کے جیوں سناسی ہے

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

جس کی گفتار میں نہیں ہے مزا
سخن اس کا طعام باسی ہے

اے ولی! جو لباس تن پہ رکھا
عاشقاں کے نزک لِباسی ہے

لفظ و معنی

(۱)

اپس کے گھر سوں ۔ اپنے گھر سے

موہن ۔ محبوب

سوں ۔ سے

حوراں ۔ حور کی جمع

دیول ۔ مندر، صنم خانہ

سانکل ۔ (سنکل)۔ زنجیر

پگ ۔ قدم، پانو

سودا ۔ دیوانگی، عشق، دھن

(۲)

کوچۂ یار ۔ محبوب کی گلی

عین ۔ ٹھیک، ہو بہو

کاسی ۔ کاشی، بنارس

باسی ۔ باشندہ رہنے والا

بیراگ ۔ سنیاس

پی ۔ محبوب

اُپر ۔ اوپر

خال ۔ تل

نزک ۔ نزدیک

سناسی ۔ سنیاسی

جیوں ۔ جیسے

طعام باسی ۔ باسی کھانا

زنخداں ۔ ٹھوڑی

آپ نے پڑھا

- ولی دکنی قدیم اردو شاعروں میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش اور وفات کے تعلق سے محققین کے درمیان شدید اختلافات رہے ہیں۔
- یہ تاریخی صداقت ہے کہ ولی دلی آئے اور ان کا دیوان بھی آیا۔ البتہ ان کی تاریخوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
- تاریخِ ادب میں ولی شمال اور جنوب کے درمیان ایک پل کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔
- ولی نے شمالی ہندستان کے شعرا کو ریختہ گوئی کی طرف راغب کیا اور دہلی کے مختلف شعرا کے لیے معنوی استاد کے بہ طور رہے۔ ولی کی شاعری میں دکنی روایت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔ پھر رفتہ رفتہ ولی نے اپنی شاعری کو دکنی پن سے بہت حد تک پاک کیا اور اس کی زبان پورے ملک کے لیے قابلِ قبول بن گئی۔
- ولی کی شاعری میں نادر تشبیہات اور استعارات کا بہترین استعمال ہوا ہے۔ زبان کی سطح پر ولی کے یہاں حیرت انگیز سادگی اور صفائی دیکھی جاتی ہے۔ ولی کے بعض اشعار بالکل موجودہ عہد کے معلوم ہوتے ہیں۔
- ولی کے عشق کا دائرہ کار بے حد وسیع ہے۔ اس میں سنجیدگی، گہرائی، ضبط اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا سوز اور شیرینی نمایاں ہے۔ ولی اپنے تصورِ عشق کے ذریعے تصوف کی روایت کو موضوعات کی وسعت کے ساتھ اردو شاعری کے دامن میں ایک خاص جگہ عطا کرتے ہیں۔
- دکنی میں جمع بناتے وقت 'اں' کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً 'حور' سے 'حوراں' ولی نے بھی اپنی غزلوں میں یہ طریقہ رائج رکھا۔
- ولی دکنی کی غزلوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں دور از کار مثالیں استعمال نہیں کرتے بالعموم وہ مثالیں فارسی روایت سے اخذ کرتے ہیں۔
- ولی دکنی کی زبان میں ہندستانیت کا بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے ہاں جو الفاظ ملتے ہیں وہ زیادہ تر ہند آریائی ہوتے ہیں۔

آپ بتائیے

1. پہلے شعر میں 'مومن' کسے کہا گیا ہے؟
2. حیدرآبادی علما ولی کا پورا نام اور جائے پیدائش کے متعلق کیا بتاتے ہیں؟
3. تاریخ ادب میں ولی کس کے درمیان ایک پُل کی طرح دکھائی دیتے ہیں؟
4. دوسری غزل کے پہلے شعر کے مطابق شاعر کا دل (جوگی دل) کہاں کا باسی ہے؟
5. ولی کا اصل نام اور مقامِ پیدائش گجراتی محققین کی نظر میں کیا ہے؟
6. پی کے بیراگ کے معنی بتائیے۔

7. خوروں میں کس کے مکھ کی شہرت ہے؟
8. شاملِ نصاب غزلوں سے دو دکنی الفاظ درج کیجیے۔
9. ولی نے شمالی ہندستان کے شعرا کو کس طرف راغب کیا؟
10. رشکِ چین سے کیا سمجھتے ہیں؟
11. ولی کے کس شاگرد نے دیوان ولی کا مخطوطہ کس سنہ میں لکھا؟

مختصر گفتگو

1. ولی کی زبان پورے ملک کے لیے کیسے قابلِ قبول بن گئی؟
2. ان کی شاعری کی دو خوبیوں کو واضح کیجیے۔
3. ولی نے شاملِ نصاب دوسری غزل کے پہلے شعر میں کوچۂ یار اور اپنے دل کے بارے میں کیا کہا ہے؟
4. ولی کی غزلوں میں مثالوں کے استعمال کی شکل کیا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. ولی کے حالاتِ زندگی سے اپنی واقفیت ظاہر کیجیے۔
2. ولی کی شاعری کی خوبیاں مثالوں سے واضح کیجیے۔
3. ولی کی شاملِ نصاب غزلوں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

- نیچے دیے گئے الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ جنسیت واضح ہو جائے۔

قدم، تماشا، حقیقت، استقبال، فجر، دل، اداسی، زلف، گفتار، سخن

آیئے، کچھ کریں

- کتب خانے کی مدد سے ولی کے حالاتِ زندگی معلوم کیجیے۔
- ولی کی چند مشہور غزلوں کو اپنی کاپی میں لکھیے۔
- ولی کے دس ویسے اشعار نوٹ کیجیے جو بالکل عام فہم و سادہ ہیں۔

راسخ عظیم آبادی

اصل نام شیخ غلام علی اور تخلص راسخ تھا۔ والد کا نام شیخ محمد فیض تھا۔ راسخ کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا عظیم آباد آکر مستقل آباد ہو گئے۔ یہیں راسخ کی پیدائش 58-1757 کے قریب ہوئی۔

راسخ کے تفصیلی حالات کہیں دستیاب نہیں۔ انھوں نے کہاں اور کتنی تعلیم پائی اس کے متعلق بھی تذکرے خاموش ہیں لیکن ان کی تحریروں سے یہ واضح ہے کہ وہ اردو، فارسی اور فنِ عروض سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ شاعری میں انھوں نے پہلے مرزا محمد فدوی سے اصلاح لی اور پھر محمد تقی میر کے شاگرد ہوئے۔

راسخ اقتصادی اعتبار سے ہمیشہ کمزور رہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے کلکتہ، لکھنؤ اور مرشد آباد کا سفر بھی کیا تھا لیکن عمر بھر انھوں نے کہیں کوئی ملازمت نہیں کی۔ بڑھاپے میں طبیعت تصوّف کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ راسخ نے فنِ عروض پر ایک مختصر رسالہ لکھا۔ کلیات کی شکل میں ان کا شعری سرمایہ محفوظ ہے جس میں غزلیں، قصائد، رباعیات، مدحیہ قطعات، مثنویات، مخمسات اور واسوخت شامل ہیں۔ راسخ کی وفات 1823 میں ہوئی۔ ان کی قبر محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی میں ہے۔

غزلیں

(۱)

کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینۂ دل ہوتا
صاف ہوتا تو رخِ یار کے قابل ہوتا

کامل اپنے تئیں جانا رہا ناقص زاہد
نقص پر اپنے نظر ہوتی تو کامل ہوتا

ترکِ لذّات کی لذّت نہ ہوئی ہم کو نصیب
یہ مزا کاش ہمارے تئیں حاصل ہوتا

تم سے کچھ بندہ نے چاہا تو تمھیں کو چاہا
اور کیا مانگتا کس چیز کا سائل ہوتا

مشتری اپنا تو وہ ماہ سمجھتا مجھ کو
میں بھی یوسف کے خریداروں میں داخل ہوتا

دام میں عقلِ مزوّر کے نہ آیا راسخ
خوش رہا کیا وہ دوانا تھا جو عاقل ہوتا

(۲)

ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صحِ پیری کا ستارا ہے

خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ
خوشا وے اہلِ دل جن پر نہاں بھی آشکارا ہے

فلک ایسا ہمارے درپے ایذا نہ تھا آگے
یہ بے مہری تمھاری ہے تمھارا ہی اشارا ہے

یہی کہہ کہہ کے مارا اپنے بیمارِ محبت کو
کہ تو مرنے سے ڈرتا ہے بہت جی تجھ کو پیارا ہے

شروعِ عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے جی ڈوبا
کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمھارا ہے

لفظ و معنی

(۱)

بوں ۔ ایسا

تیرہ ۔ کالا، سیاہ

رخِ یار ۔ محبوب کا چہرا

اپنے تئیں ۔ اپنے کو، اپنی ذات کو

ترکِ لذات ۔ آرام و آسایش کی چیزیں چھوڑ دینا

مشتری ۔ خریدار

مزوّر ۔ جھوٹا، مکر و فریب کرنے والا

(۲)

دیدنی ۔ دیکھنے کے لایق

نہاں ۔ پوشیدہ

آشکارا ۔ ظاہر، نمایاں

خوشا ۔ مسرت کا کلمہ، بہت اچھے، خوب

فلک ۔ آسمان

درپے ایذا ہونا ۔ نقصان پہنچانے کی تاک میں ہونا

بے مہری ۔ بے توجہی، بے رخی

آپ نے پڑھا

- شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی 1758-1757 میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کو فدوی اور میر تقی میر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ راسخ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن خصوصی طور پر غزل اور مثنوی کی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔
- ان کی منتخب دونوں غزلیں اپنے اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے گرچہ روایتی رنگ و آہنگ کی حامل ہیں لیکن فنی طور پر یہ حد درجہ پختہ اور پرکشش ہیں۔
- راسخ کے مطابق اگر دل کا آئینہ تاریک اور دھندلا نہ ہوتا تو معشوق اس میں اپنا رخِ روشن دیکھتا۔ اگر زاہد اور عبادت گزار کی اپنے

نقص پر نظر ہوتی تو وہ خود کو کامل اور نیک نہیں کہتا۔

- شاعر کے مطابق فلک یا قدرت کی ایذا رسانی مجھے کبھی نہیں جھیلنی پڑتی۔ یہ معشوق کی خفگی کی وجہ سے ہے۔ بلکہ اسی کے اشارے پر سب کچھ ہو رہا ہے۔
- راسخ نے بعض مقامات پر روایتی عشق کے معاملات کو بھی بہت ہی ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاعر کے مطابق عشق کی ابتدا میں ہی جب اتنی بدحواسی اور گھبراہٹ طاری ہے تو آگے کی منزلیں کس طرح طے ہوں گی۔ یہ تو محض دریا کا کنارہ ہے۔ آگے دریا کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کا سامنا ہوگا۔

آپ بتایئے

1. راسخ کا پورا نام کیا تھا؟
2. راسخ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
3. راسخ کس کے شاگرد تھے؟
4. میر کی شاگردی پر کون فخر کرتا تھا؟
5. راسخ نے خصوصاً کس کس صنف میں طبع آزمائی کی؟
6. رخِ یار کے قابل کون ہوتا؟
7. فلک کس کے اشارے پر ایذا پہنچانے لگا؟
8. دل کیوں ڈوبا جا رہا تھا؟

مختصر گفتگو

1. راسخ عظیم آبادی نے کن کن شاعروں سے اصلاح لی؟
2. راسخ کو کس کس صنف سے خاص شغف تھا؟
3. میر کی تربیت کا کیا اثر ہوا؟
4. راسخ کی موت کب اور کہاں ہوئی؟
5. راسخ کا کلام کس نام سے شائع ہوا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. راسخ عظیم آبادی کے احوال پر روشنی ڈالیے۔
2. راسخ کس دور کے شاعر ہیں؟ ان کے چند اہم معاصرین کے نام لکھیے۔

3. راسخ کی شاعرانہ خصوصیات کیا ہیں؟
4. کس کے اشارے سے عاشق کو مصیبتوں کا سامنا ہے؟
5. عشق کے آغاز میں کیا حال ہے، آگے کیا ہونے والا ہے؟

- ذیل کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

کامل اپنے تئیں جانا رہا ناقص زاہد
نقص پر اپنے نظر ہوتی تو کامل ہوتا

ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

- مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

1. کاش یوں تیرہ نہ یہ.....
2. ترکِ لذّات کی لذّت.....
3. یہی کہہ کہہ کے مارا اپنے.....
4. فلک ایسا ہمارے.....
5. ..... تمھارا ہی اشارہ ہے

آیئے، کچھ کریں

1. راسخ عظیم آبادی کی تصویر حاصل کیجیے اور اسے اپنی ڈرائنگ کاپی میں ہو بہو اسکیچ کیجیے۔
2. راسخ عظیم آبادی کی کوئی غزل یاد کر لیجیے اور اپنے احباب کو خوب صورت انداز میں سنایئے۔

قصیدہ

قدیم شعری اصناف میں قصیدے کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ رہی کیوں کہ استادانہ رکھ رکھاو اور زبان و بیان کے زور کو دکھانے کے لیے قصائد سے بہتر کوئی صنف نہیں تھی۔ فارسی میں اس صنف کا زور اتنا رہا کہ تقریباً تمام اہم شعرا نے لازماً قصائد کہے۔ فارسی کے اثر سے ہی اردو میں قصائد کا چلن بڑھا۔ فارسی کے شعرا نے جو انداز اور اجزا مقرر کر دیے تھے، اسے بہت حد تک اردو شاعروں نے بھی تسلیم کیا۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی جو اکثر شعرا کے یہاں اصول کے طور پر موجود ہیں، وہ یہ ہیں: تشبیب، گریز، مدح، طلب اور دعا لیکن روایتی طور پر ان تمام اجزا کے لیے الگ الگ قوانین طے کیے گئے ہیں۔

دکن کے شاعر نصرتی نے 'علی نامہ' میں پہلی بار قصیدہ گوئی کا کامیاب تجربہ کیا لیکن اٹھارھویں صدی میں مرزا محمد رفیع سودا نے قصیدہ گوئی میں وہ کمال حاصل کیا کہ انھیں مصحفی نے اس صنف کا نقاشِ اوّل تسلیم کیا۔ انشا اللہ خاں انشا نے بھی بعض قصائد اٹھارھویں صدی میں ہی لکھے۔ انیسویں صدی میں شیخ محمد ابراہیم ذوق نے سودا کے بعد اپنی بہترین قصیدہ گوئی کی وجہ سے عظمت حاصل کی۔ اسی زمانے میں غالب اور مومن نے بھی الگ انداز کے قصائد لکھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں قصیدے کا آخری بڑا فن کار محسن کاکوری کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے اپنے نعتیہ قصیدے 'سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل' سے سب کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔

تعلیم کی ترقی اور بادشاہت کے زوال نے قصیدے کی ضرورت ہی ختم کر دی۔ اس صنف کا جاگیردانہ نظام سے زیادہ تعلق تھا، اس لیے اس جمہوریت نے اس کے لیے مددگار ماحول بھی ختم کر دیا۔ آج کے زمانے میں قصیدہ گوئی کو خوشامد اور چاپلوسی کا بدل مانا جا سکتا ہے۔ اسی لیے قصیدہ گوئی کو ہمارے زمانے میں ایسا ماحول نہیں ملا جس سے اس کی ترقی ہو سکے۔

قصیدہ ایسی صنف سخن ہے جس میں کسی شخص کی تعریف کی جائے۔ اس سے ٹھیک الٹی صورت بھی قصیدوں کے لیے مرغوب رہی۔ آپ چاہیں تو کسی شخص یا واقعے کی مذمّت کرنی ہو تب بھی قصیدہ گوئی کی جا سکتی ہے۔ اسے ادبی اصطلاح میں ہجو کہتے ہیں۔ سودا نے قصیدے کے ساتھ ہجو گوئی میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

مرزا محمد رفیع نام اور تخلص سودا تھا۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ سودا کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں محققین کے درمیان کافی اختلاف رائے ہے۔ مختلف محققین کی آرا سے بحث کرتے ہوئے جناب حنیف نقوی نے 1125ھ سے اتفاق کیا ہے اور یہ سنہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سودا تقریباً 1713 میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد اور ابتدائی حالات کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں۔ ان کے والد تجارت کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ سودا کا بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا۔ ان کی تعلیم و تربیت کا حال بھی معلوم نہیں۔ مصحفی نے انھیں 'کم علم' کہا ہے لیکن قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ 'عبرت الغافلین' کا مصنف جاہل نہیں ہوسکتا۔ سودا کی شادی کب اور کس سے ہوئی اور انھیں اولاد تھی یا نہیں، اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ کہنا محال ہے۔

والد کے انتقال کے بعد سودا کی، فوج میں ملازمت کے حوالے ملتے ہیں لیکن اس ملازمت کا زمانہ بہت مختصر رہا۔ سودا نے اپنی عمر کا بقیہ حصہ امرا کی مصاحبت میں بسر کیا۔ بسنت خاں خواجہ سرا، احمد علی خاں، نواب عماد الملک غازی الدین خاں، مہربان خان رند، شجاع الدولہ اور آصف الدولہ ان کے مربی اور کفیل رہے۔ 1781 میں یہ مقام لکھنؤ وفات پائی اور آغا امام باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ وہ بڑے مزاج شناس اور خوش گفتار تھے۔ اپنے ہر مربی کا انھیں تقرب حاصل تھا۔

سودا پہلے فارسی میں مشقِ سخن کرتے تھے، سراج الدین علی خاں آرزو نے توجہ دلائی تو اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ وہ فارسی میں خان آرزو سے اور اردو میں شاہ حاتم سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ انھیں اپنے وقت کا ملک الشعرا بھی کہا گیا لیکن انھیں یہ خطاب کسی سرکار یا دربار سے نہیں ملا تھا۔ موسیقی سے انھیں خاصا شغف تھا اور کتے پالنے کے شوقین تھے۔ سودا زود رنج تھے لیکن عفو و درگذر سے بھی کام لیتے تھے۔

سودا نے غزل، قصیدہ، مثنوی، ہجو، سلام و مراثی، رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدہ اور ہجویات میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ قصیدے کے تو وہ بادشاہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ 'تضحیکِ روزگار' ان کا مشہور ترین ہجو یہ قصیدہ ہے جس میں گھوڑے کے پردے میں انھوں نے مغلیہ سلطنت اور اس کے سیاسی و معاشی زوال کی دل چسپ لیکن عبرت ناک تصویر کھینچی ہے۔

سودا نے فارسی میں ایک رسالہ 'عبرت الغافلین' کے نام سے لکھا۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس رسالے میں مرزا فاخر مکیں کی ان اصلاحوں پر اظہار خیال کیا ہے جو انھوں نے فارسی اساتذہ کے کلام پر دی تھیں۔ محمد حسین آزاد نے اردو کے نثری رسالے 'شعلۂ عشق' کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ رسالہ اب کہیں دستیاب نہیں۔

قصیدہ در ہجو اسپ المسمّیٰ بہ تضحیکِ روزگار

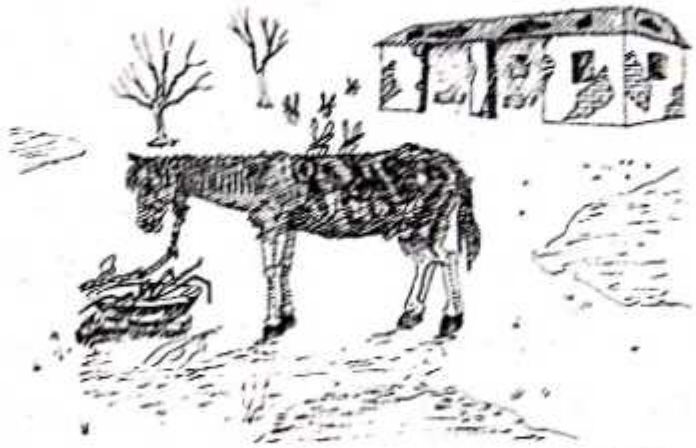

ہے چرخ، جب سے ابلقِ ایام پر سوار — رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بہ یک قرار
جن کے طویلے بیچ، کوئی دن کی بات ہے — ہرگز، عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں، کہ زمانے کے ہاتھ سے — موچی سے، کفش پا کو، گٹھاتے ہیں وہ ادھار
تنہا وَلے، نہ دہر سے عالم خراب ہے — خست نے، اکثروں سے اٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ، ایک ہمارے بھی مہرباں — پاوے سزا، جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے، دنایت کی راہ سے — گھوڑا رکھیں ہیں ایک، سو اتنا خراب و خوار
نے دانہ و نہ کاہ، نہ تیمار، نے سئیس — رکھتا ہو جیسے اسپِ گلی، طفلِ شیر خوار
ناطاقتی کو اس کی، کہاں تک کروں بیاں؟ — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار؟
مانندِ نقشِ نعل، زمیں سے، بہ جز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ، اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے، راکب اس کا، جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد؟ — امیدوار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے، اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ — گزرے ہے اس نمط اسے، ہر لیل و ہر نہار
ہر رات، اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف، ہو کے بے قرار
خطِ شعاع کو، وہ سمجھ دستۂ گیاہ — ہر دن زمیں پر آپ کو پٹکے ہے بار بار

دیکھے ہے جب وہ تو بڑے اور تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سُم سے کنویں، ناپیں مار مار

ہے اس قدر ضعیف، کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نے استخواں، نہ گوشت، نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے، کہ جوں کھال کو لہار

ہر زخم پر زبس، کہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو گمسی، اس اعتبار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں، جایئے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس، قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے، وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی، میں نے کیا جاکے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مُستعار

فرمایا تب انھوں نے کہ اے مہربانِ من!
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسو کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے، اس کو نہ جانوگے انکسار

بدرنگ، جیسے لید ہے، بدبو ہے جوں پشاب
بدیمن یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار

حشری ہے اس قدر کہ بہ حشر اس کی پشت پر
دجّال، اپنے منہ کو سیہ کرکے ہو سوار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن
پہلے، وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروے تواریخ یاد ہے
شیطان اسی پہ نکلا تھا جنّت سے ہو سوار

کم رَو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بناوے کوئی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ، روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے، وقتِ کار زار

مانندِ اسپ خانۂ شطرنج، اپنے پانو
جز دستِ غیر کے، نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا، مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا، اس پہ ہو سوار

پہنچا غرض، عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے، کر اس طرف گذار

گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے، تم نے جو سنی
اس پر بھی دل میں آوے، تو اب ہو جیے سوار

سن کر تب ان سے میں نے یہ قصہ، دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا، کیا ہے ضرور یار!

گفتن ہمیں بس است کہ 'اسپِ من ابلق است'
سمجھوں گا دل میں اپنے اگر ہوں میں ہوشیار

سودا نے تب قصیدہ کہا، سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدے کا 'تضحیکِ روزگار'

لفظ و معنی

در ہجوِ اسپ	-	گھوڑے کی برائی میں
تضحیک	-	مذاق اُڑانا، ہنسی یا رسوائی
چرخ	-	آسمان
ابلق	-	دورنگا گھوڑا جو سرخ و سفید یا سفید یا سیاہ رنگ کا ہو، ایسے گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے چاروں پیر سفید ہوں
اَبلقِ ایام	-	دن رات کی رعایت سے زمانے کو ابلق کہا ہے
عناں	-	لگام، باگ ڈور
شمار	-	حساب، گنتی
کفشِ پا	-	پیروں کی جوتی
ولے	-	لیکن، مگر
خِست	-	کنجوسی، کمینہ پن
ننگ	-	لحاظ، شرم، ذلت
عار	-	غیرت، شرم
نہار	-	صبح سے کچھ نہ کھائے ہوئے، دن، روز، یوم
دنایت	-	کمینہ پن، حقیر ہونا
کاہ	-	کٹی ہوئی سوکھی گھاس
اسپِ گلی	-	مٹی کا گھوڑا
طفلِ شیر خوار	-	دودھ پیتا بچہ
نعل	-	گھوڑے بیل وغیرہ کے کھر میں لگانے کا آہنی حلقہ
راکب	-	جانور یا جہاز پر سوار ہونے والا
نَمَط	-	طرح، مثل
اختر	-	ستارا
لیل	-	رات

خطِ شعاع - روشنی کی لکیر

گیاہ - گھاس

توبڑا - وہ تھیلا جس میں گھوڑے کو کھانا کھلاتے ہیں

سُم - کھر

ضعیف - کمزور، بوڑھا

باد - ہوا

میخ - کھونٹا

اُستوار - مضبوط

اُستخواں - ہڈی

مگس - مکھی

قضارا - اتفاقاً، یکا یک

نابکار - بے کار

اِلتماس - گزارش، درخواست

مُستعار - ادھار لیا ہوا، مانگا ہوا

بدیُمن - منحوس، نامبارک

حشری - وہ گھوڑا جو اور گھوڑوں کے ساتھ مل کر نہ رہے

دجّال - ایک جھوٹا شخص جو اخیر زمانے میں پیدا ہوگا اور اس کو حضرت عیسیٰؑ قتل کریں گے

ریگ - بالو، ریت

کم رَو - تھوڑا چلنے والا

کارزار - لڑائی، جنگ

زینہار - ہرگز

عروس - دلہن

شیخوخیت - (شیخوخت) بڑھاپا

گفتن ہمیں بس است کہ اسپِ من اَبلق است۔ یہی کہنا کافی ہے کہ میرا گھوڑا اَبلق ہے

آپ نے پڑھا

- قصیدہ وہ صنفِ سخن ہے جس میں کسی کی مدح یا ہجو کی جائے۔
- قصیدے کے اَجزائے ترکیبی ہیں۔ تشبیب، گریز، مدح، دعایا حسنِ طلب۔
- قصیدے کو درجۂ کمال تک پہنچانے والے سودا ہیں۔ قصیدہ گوئی کے لیے جس بلند تخیل، مضمون آفرینی، خیال بندی، قدرتِ زبان اور ذہنی اپج کی ضرورت ہوتی ہے وہ سودا میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔
- سودا کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ (۱) زمین مشکل منتخب کرتے ہیں لیکن نشست الفاظ سے دل آویز بنا دیتے ہیں۔ (۲) قصیدے کی شان یعنی متانت، پختگی، زورِ الفاظ، مضمون آفرینی اور تخیل سودا کے قصائد میں موجود ہے۔ (۳) استعارے اور تشبیہوں کے استعمال میں جدّت و ندرت سے کام لیتے ہیں (۴) ان کے قصائد میں محاکاتی شاعری نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہے۔
- سودا پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو اس قدر شدّت کے ساتھ اردو میں نظم کیا۔ ہجو کا استعمال اگر اچھی طرح کیا جائے تو کارآمد باتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ مذاق اڑا کر عیوب دور کیے جا سکتے ہیں۔
- سودا کے بعض قصائد سے پتا چلتا ہے کہ وہ گہرا سماجی شعور رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے تضادات اور کھردرے پن پر بہ ظاہر ہنستے نظر آتے ہیں لیکن ان کی ہنسی کی تہہ میں اشکوں کا ایک طوفان چھپا ہوا ہے۔
- 'تفحیکِ روزگار' سودا کی خلاّقانہ طبیعت اور شگفتگیِ مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس شگفتگی میں ہمیں ایک تلخی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ بہ ظاہر ایک گھوڑے کی ہجو ہے لیکن دراصل یہ فوجی نظام کی ابتری کا مرثیہ ہے۔

مختصر گفتگو

1. قصیدہ نگاری کا 'نقاشِ اوّل' کسے کہا جاتا ہے؟
2. قصیدے کی ابتدا کس زبان میں ہوئی تھی؟
3. سودا نے تقریباً کتنے قصیدے لکھے؟
4. فارسی زبان کے کن قصیدہ نگاروں کو سودا نے اپنے لیے نمونہ بنایا؟
5. سودا کا سب سے مشہور ہجو یہ قصیدہ کون ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. قصیدے کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
2. ہجو سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

3. 'تضحیکِ روزگار' میں کس کا مذاق اڑایا گیا ہے؟ تفصیل سے بتائیے۔
4. سودا نے قصیدہ 'تضحیکِ روزگار' میں کیا کہنے کی کوشش کی ہے؟
5. سودا کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
6. سودا کی قصیدہ نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

- تشریح کیجیے۔

ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں؟ — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار؟
مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بہ جز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن — پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروے تواریخ یاد ہے — شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

- واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

فعل، حال، تواریخ، خدمات، وقت

آیئے، کچھ کریں

1. سودا کے اہم قصائد کی فہرست موضوعاتی اعتبار سے بنائیے۔
2. سودا سے قبل اور سودا کے بعد کے اہم قصیدہ نگاروں کے متعلق معلومات حاصل کیجیے۔
3. سودا کا عہد اردو شاعری کا عہدِ زرّیں ہے۔ اس قول کی صداقت معلوم کیجیے۔

گیت

ہندوی ادب کا قدیم سرمایہ گیت میں محفوظ ہے۔ اس صنف کے نام سے ہی اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اسے گانے سے نسبت ہے۔ شاعری میں عروض اور آہنگ کا ایک مقصد بلاشبہ نغمگی ہے لیکن وہاں گانے کا کوئی لازمی پہلو نہیں نکلتا۔ گیت کی ترقی کے بعد تو اب بعض شعرا مشاعروں میں تحت اللفظ گیت پڑھتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔

سنسکرت یا ہندی شاعری میں بھی گیت کے لیے ہیئت مخصوص نہیں ہے۔ اس کے لیے کسی خاص بحر یا چھند کی بھی قید نہیں۔ پرانے گیت شدتِ جذبات اور عاشقانہ افتاد کے لیے وقف مانے جاتے تھے۔ خاص طور سے عورت کے محبوبانہ جذبات اور ملن کی آس میں تڑپنے کی کیفیات کی سب سے موزوں ترجمانی عہدِ وسطیٰ کے گیتوں میں ہوتی ہے۔

اردو میں عام طور پر گیتوں سے بے توجہی برتی گئی۔ عظمت اللہ خاں، میراجی، جمیل الدین عالی جیسے شعرا نے باضابطہ گیت کہے۔ بعد میں فلموں اور مشاعروں کی وجہ سے گیتوں کی طرف اردو شاعروں کی توجہ ہوئی۔ اجمل سلطان پوری، بیکل اتساہی، وسیم بریلوی، ساغر اعظمی اور زبیر رضوی نے مشاعروں کے ذریعہ اپنے گیت پیش کیے۔ ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، راجا مہدی علی خاں، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، ندا فاضلی اور نظر گورکھپوری وغیرہ نے فلموں میں گیتوں کو اعتبار بخشا۔

آج گیتوں کے موضوعات اسی طرح سے لامحدود ہیں جس طرح غزل یا نظم کا معاملہ ہے۔ ہر طرح کے موضوعات کو بہت سلیقے سے ہمارے شعرا گیتوں میں شامل کر کے دادِ سخن لے رہے ہیں۔ عصرِ حاضر کے مسائل بھی ان گیتوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ شہر اور گانو کے تضادات اور ٹکراؤ کی عکاسی بھی بعض گیت لکھنے والوں نے اپنے گیتوں میں کی۔ ہر چند آج بھی اس صنف کو قبولِ عام کا درجہ حاصل نہیں ہے اور اردو کی بڑی صنفوں کے مقابلے اس کا سرمایۂ سخن بھی کم ہے لیکن اس صنف میں روز افزوں ترقی کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

BSTBPC-2018

ساحر لدھیانوی

اصل نام عبدالحیٔ اور ساحر تخلّص تھا۔ 8 مارچ 1912 کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ساحر کے والد چودھری فضل محمد اور دادا فتح محمد نامی گرامی زمین دار تھے۔ سردار بیگم ان کی والدہ تھیں۔ ساحر کے والدین کے آپسی تعلقات اچھے نہیں رہے اور دونوں میں علاحدگی ہوگئی۔ ساحر اپنی والدہ کے ہمراہ رہے۔ ماں بیٹے کی سرپرستی ان کے ماموں عبدالرّشید نے کی۔

ساحر نے مالوہ خالصہ اسکول میں فیاض ہرگانوی سے اردو اور فارسی کا درس لیا انٹر کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کا تعلّق آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن نامی طلبہ کی تنظیم سے ہوگیا جو کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر تھی۔ وہ سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھنے لگے۔ سرکار نے ان کی بعض نظمیں ضبط کرلیں۔ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے انھیں کالج چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور وہ لدھیانہ سے لاہور چلے گئے اور یہاں انھوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا لیکن یہاں بھی اپنی تعلیم پوری نہیں کر سکے۔

ساحر کو جاگیردارانہ نظام اور برطانوی سامراج سے نفرت تھی۔ انھوں نے باضابطہ اشعار کہنے شروع کیے۔ وہ مشہور رسالے 'ادبِ لطیف' کے مدیر اعلا مقرّر ہوئے۔ 1945 میں وہ سجّاد ظہیر، علی سردار جعفری وغیرہ کے ہمراہ بمبئی آئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت وہ بمبئی میں ہی تھے۔ انھوں نے فسادات کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ساحر کے دوستوں نے ان کی ماں کو پاکستان بھجوا دیا تھا جو تقسیمِ عظیم کے وقت لدھیانہ میں ہی تھیں۔ ساحر ماں کی تلاش میں لاہور گئے۔ وہاں قیام کے دوران چودھری نذیر کے رسالے 'سویرا' سے منسلک ہوگئے۔ لاہور سے دلّی آنے پر وہ 'شاہ راہ' کے مدیر مقرّر ہوئے۔ انھوں نے 'پریت لڑی' کی بھی ادارت کی۔

مئی 1949 میں بھیمڑی (بمبئی) میں ترقّی پسند مصنّفین کانفرنس میں شرکت کے لیے ساحر بمبئی آئے تو انھوں نے یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کیا اور فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ نغمہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے زبردست شہرت حاصل کی۔ 1971 میں انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ انھیں ان کے مجموعے 'آؤ کوئی خواب بُنیں' پر 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' بھی پیش کیا گیا۔

ساحر زندگی بھر کنوارے رہے۔ جولائی 1976 میں ان کی والدہ کا وصال ہوا تو وہ بجھ سے گئے اور خود بھی 25 اکتوبر 1980 کو اس جہاں سے رخصت ہوگئے اور بمبئی میں مدفون ہوئے۔

'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'، 'پرچھائیاں'، 'تلخیاں'، 'گاتا جائے بنجارہ' اور 'آخری نذرانے' ان کی کتابیں ہیں۔

ساحر لدھیانوی

گیت

ساتھی ہاتھ بڑھانا
ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اُٹھانا
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے فولادی ہیں بانہیں
ہم چاہیں تو پیدا کردیں چٹانوں میں راہیں
ساتھی ہاتھ بڑھانا

محنت اپنی لیکھ کی ریکھا، محنت سے کیا ڈرنا
کل غیروں کی خاطر کی آج اپنی خاطر کرنا
اپنا دُکھ بھی ایک ہے ساتھی اپنا سکھ بھی ایک
اپنی منزل سچ کی منزل، اپنا رستہ نیک
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک سے ایک مِلے تو قطرہ بن جاتا ہے دریا
ایک سے ایک مِلے تو ذرّہ بن جاتا ہے صحرا
ایک سے ایک مِلے تو رائی بن سکتی ہے پربت
ایک سے ایک مِلے تو انساں بس میں کرلے قسمت
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ماٹی سے ہم لعل نکالیں موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے بنا ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں
ساتھی ہاتھ بڑھانا

BSTBPC-2018

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے

تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اُسے ہندو یا مسلمان بنایا
قدرت نے جو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت کہیں ایران بنایا

جو توڑ دے ہر بند وہ طوفان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے

تو امن کا اور صلح کا اعلان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

یہ دین کے تاجر یہ وطن بیچنے والے
انسانوں کی لاشوں کے کفن بیچنے والے
یہ محلوں میں بیٹھے ہوئے قاتل یہ لٹیرے
کانٹوں کے عوض روحِ چمن بیچنے والے

تُو اِن کے لیے موت کا اعلان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

SHAD

لفظ و معنی

سیس	-	پیشانی
فولادی	-	لوہے کا بنا ہوا، بہت سخت اور مضبوط
لیکھ کی ریکھا	-	مقدّر کی لکیر
صحرا	-	ریگستان
بَل	-	طاقت، قوت
حَرم	-	خانۂ کعبہ کی چار دیواری
عوض	-	بدلہ

آپ نے پڑھا

- مذکورہ گیت شاعر ساحر لدھیانوی کی تخلیق ہے جن کا شمار ہندی فلم انڈسٹری کے عظیم گیت کاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس گیت کو فلم 'نیا دور' کے لیے لکھا تھا۔
- گیت ہندی الاصل صنفِ شاعری ہے اور اسے اردو میں قبولیت حاصل ہے۔ اردو میں لکھے جانے والے گیت عام طور پر ہندی بحروں میں ہی ہیں۔
- گیت میں موضوع کی قید نہیں ہوتی۔ اس میں محبت اور نغمگی کے عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔
- پیشِ نظر گیت مل جل کر کام کرنے کے مرکزی خیال پر لکھا گیا ہے۔ گیت کا پس منظر یہ ہے کہ ہندستان میں صنعتی انقلاب آ رہا تھا اور کارخانوں کو جدید مشینی آلات سے مزّین کیا جا رہا تھا۔ نتیجتاً محنت کش مزدوروں کو اپنے کام سے جبراً سبک دوش ہونا پڑ رہا تھا جس سے روزگار کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مزدوروں میں مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ انھی مزدوروں کے بیچ متحد ہو کر اپنے حقوق کے لیے لڑنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ساحر نے اس گیت کی تخلیق کی۔
- شاعر نے متعدد مثالوں سے ایک ساتھ مل جُل کر کام کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب محنت کشوں نے متحدہ ہو کر کام کیا تو ساگر نے بھی رستہ دے دیا اور پہاڑ بھی زیر ہو گئے۔
- شاعر کے مطابق مزدوروں کو محنت کرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ جب کل تک غیروں یعنی انگریزوں کے لیے محنت کرتے تھے تو آج اپنے آزاد ملک کی ترقّی کے لیے ہمیں محنت کرنا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ رہنا ہے اور سچائی اور ایمان داری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے رہنا ہے۔
- اجتماعی کوششوں اور محنت سے انسان تقدیر کو اپنے بس میں کر سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے تمام عظیم کام مزدوروں کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے ہمیں دولت والوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے حقوق حاصل کرنے اور خوابوں کی تکمیل کے

آپ بتائیے

1. شاعر نے اس گیت کو کس فلم کے لیے لکھا ہے؟
2. اس گیت کا کیا موضوع ہونا چاہیے؟
3. بنیادی طور پر یہ گیت سماج کے کس طبقے کے لیے لکھا گیا ہے؟
4. قطرہ قطرہ مل کر کیا بنتا ہے؟
5. موتی کہاں سے نکلتا ہے؟
6. 'ساتھی ہاتھ بڑھانا' اس گیت میں کتنی بار آیا ہے؟
7. اس گیت کے شاعر کا نام بتائیے۔

مختصر گفتگو

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے فولادی ہیں بانہیں
ہم چاہیں تو پیدا کردیں چٹانوں میں راہیں

1. محنت والے جب قدم بڑھاتے ہیں تو کیا ممکن ہو پاتا ہے؟
2. فولادی ہیں سینے اپنے اور فولادی ہیں بانہیں سے کیا مراد ہے؟
3. کس کے چاہنے سے چٹانوں میں راہیں پیدا ہو سکتی ہیں؟
4. اس اقتباس کی تشریح کریں اور اس کے مرکزی خیال کو واضح کریں۔

تفصیلی گفتگو

ماٹی سے ہم لعل نکالیں موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے بنا ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں

1. لعل کہاں سے نکالنے کی بات ہو رہی ہے؟ زمین سے نکلنے والی چیزوں کو کیا کہتے ہیں؟

کہکشاں

حصّہ دوم

SHAD CLASSES

subscribe My Channel